

پر جھکے ہوئے ہیں۔ شاید اسے پاکستان کا حسین ترین قصبہ کہنا چاہئے۔
علاؤ الدین جیپ کے پیچھے بندھا ہوا مسلمان کھول کر زمین پر رکھ رہا تھا۔
راہی بہت پریشان تھا۔ وہ ٹانگا پریت کی دیواروں کی جانب دیکھتا تھا اور پھر بے
بسی سے مسکراتا ہوا میری طرف دیکھتا تھا۔
شام ترشک پر اترنے کو تھی۔

ہمارے گرد اور مسلمان کے گرد ترشک کے کسان مزدور اور بچے جمع ہو رہے
تھے۔ وہ ہمیں دیکھ رہے تھے۔ انہیں غیر ملکی سیاحوں کو دیکھنے کی عادت تھی لیکن
پاکستانی سیاح ان کے لئے عجیب تھے۔ علاؤ الدین نے جب سارا مسلمان آثار دیا تو میں
نے اسے شب بھری کے بارے میں پوچھا۔

”میرا ایک دوست ہے گریکٹ میں۔ صاحب مجھے رات سے پہلے ادھر پہنچنا
ہے۔“ اس نے باری باری سب سے ہاتھ ملایا اور پھر اس کی جیپ نیچے اتر رہی تھی
اور پھر ہم اسے دیکھ نہیں سکتے تھے اور تب ہمیں یکدم احساس ہوا کہ باہر کی دنیا سے
ہمارا رابطہ ختم ہو گیا ہے۔ اور ہمیں بھی آج کی رات بسر کرنے کے بارے میں سوچنا
ہے۔ ایک دہلا پٹلا کچھ مسکین سا نوجوان سفید شلوار قمیض میں اور جینے ٹاک نقشے
اور سفید رنگت والا ہمارے گرد منڈلا رہا تھا۔ ”کدھر جائے گا صاحب؟ پورٹر چاہئے؟
ماڈیو جائے گا ماڈیو لے جائے گا۔ ہر جگہ لے جائے گا۔ کدھر جائے گا؟ یہ ادھر میرا
ہوٹل ہے۔ اس کا نام ٹانگا پریت ٹورسٹ کالج ہوٹل ترشک ہے۔“

”یہ ادھر ہے۔“ اس نے ندی کے ساتھ زیر تعمیر چند کمروں کی طرف اشارہ کیا
”یہ ترشک کا پہلا ہوٹل ہے۔“
”جب بنے گا تو پہلا ہوٹل ہو گا ناں؟“

”بنے گا کیوں نہیں۔ بنے گا۔ آؤ دیکھو۔ آؤ بہت اچھا کمرہ ہے۔“
”آپ ادھر مسلمان کے پاس ٹھہرو۔ میں آتا ہوں“ میں نے میرے کمرے سے کہا اور
اس نوجوان کے ساتھ ان کمروں کے اندر چلا گیا۔ تین کمرے تھے۔ ایک میں ریت
تھی بقیہ دو میں فرش پر پتھر تھے اور نین کی چمت میں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ کمرے کی
بھی تھیں لیکن ان میں شیٹے وغیرہ نہیں تھے اس لیے ہوا کی آمد و رفت کا انتظام انتہائی
تسل بخش تھا۔ غسل یا دیگر ضروریات کے لیے ترشک کے کھیت اور برقانی ندی۔
خیال رہے کہ ترشک کے کھیت میں اگر آپ بیٹھتے ہیں تو آپ کے ارد گرد پھول ہوں
گے خوشبو ہوگی اور آپ کے لبوں پر ایک معصوم مسکراہٹ کھیل رہی ہوگی۔

ترشک، پاکستان کا خوبصورت ترین گاؤں

ہم باہر آ گئے۔

ترشک!

اور ترشک کیا ہے؟

ترشک ایک مجبوری ہے۔ ترشک ایک اور فستوری ہے جہاں پہنچ کر جب میں
جیپ سے باہر نکلا ہوں تو منہ اٹھا کر جب دیکھتا ہوں تو دیکھتا چلا جاتا ہوں۔ یہاں آپ
ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ گر فروس بر روئے زمین است۔ کیونکہ یہ تو فروس بر
روئے زمین است و زمین است و زمین است۔

ٹانگا پریت کی چوٹیوں کی سفید اور آسمان تک کی دیواریں اور ان میں گھرا ہوا
ایک وسیع سبزہ زار جس میں کھیت ہیں اور پھول ہیں اور جھٹے ہیں، چند مکان ہیں ان
کے مکیں ہیں اور کھیتوں میں ابھی جو کی فصل تیار نہیں ہوئی اور کھیتوں میں جو کے
خوشے کم ہیں اور ہزاروں رنگ کے پھول زیادہ ہیں۔ یہ برقی سفید دیواریں اتنی بلند
ہیں اور اتنی قریب ہیں کہ آپ ان کی تصویر نہیں آتا سکتے۔ اور بلندی کی شفاف ہوا
ہے جو آپ کی قمیض اور بنیان کے پیچھے جا کر آپ کے ماس پر سرد بوسہ دیتی ہیں۔
آپ کا بدن تھر تھراتا ہے اور اسے مزید اور مسلسل بوسوں کی خواہش رہتی ہے اور یہ
خواہش پوری ہوتی جاتی ہے۔ ترشک کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ انگریزی محاورے کے
مطابق دیکھنا یقین کرنا ہے لیکن اسے دیکھ کر ہی یقین آتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ میں
ترشک کو اس لیے مجبوری کہتا ہوں کہ اسے آپ کے سامنے زندہ کرنا میرے بس سے
باہر ہے۔ اور یوں بھی اگر قدرت کے تمام عظیم منظر نگاروں میں اور لفظوں میں زندہ
ہو سکتے تو مجھ ایسے آوارہ گرد اپنی جان جو کھوں میں ڈال کر ان تک کیوں جاتے، اپنی
سٹڈی کی غلوت میں بیٹھ کر ان کے بارے میں کتابوں میں کیوں نہ پڑھ لیتے۔ اور
ترشک ایک بلند سطح کا علاقہ ہے۔ اور اس بلند سطح کے باوجود اس پاس کے پہاڑ اس

”یہاں سونے کا کہاں انتظام ہے؟“
 ”ادھر فرش پر۔۔۔ میں تریال بچھا دوں گا۔۔۔“
 ”نہیں ہمارے پاس خیمہ ہے۔“

”باہر سردی ہو گی صاحب۔۔۔ یہ ترشک ہے۔۔۔ اور میرا نام احسان ہے۔“
 ”ہوں“ میں نے سر ہلایا اور باہر آ گیا۔۔۔ باہر سالان تو وہیں پڑا ہوا تھا لیکن رانی
 جاپانی اور میرمن اٹھائے ادھر ادھر کھیتوں میں گھوم رہے تھے۔ میں نے ”اوتے اوتے
 “ کر کے انہیں واپس بلایا۔ اور ترشک کے واحد ہوٹل کی رہائشی سولتوں سے آگاہ کیا
 ۔ سب نے کہا کہ ہمارے پاس خیمہ ہے ہمیں کیا پرواہ ہے۔۔۔ جاپانی کے پاس اپنا خیمہ
 تھا چنانچہ وہ تو ظاہر ہے نو پرائلم۔ اور خوراک کا بھی بندوبست تھا چنانچہ بالکل نو
 پرائلم۔

اس دوران اہل ترشک کی نظریں ہم سے جدا ہو کر کچھڑ سے بھرے ہوئے اس
 راستے کی طرف اٹھ گئیں جو چورت کی طرف سے آ رہا تھا۔۔۔ شدید بارشوں کی وجہ
 سے ترشک کے آس پاس اور سڑک پر کچھڑ کی بہتات تھی۔ اس راستے پر ایک چھوٹی
 پاجیو جیپ چلی آ رہی تھی۔۔۔ یہ کہاں سے آ گئی۔۔۔ اور اس مقام سے کیسے گزر کر آ گئی
 جہاں سڑک گری ہوئی تھی۔۔۔ پاجیو نزدیک آئی تو تمام لوگ ہمیں چھوڑ کر ادھر چلے
 گئے۔۔۔ پاجیو میں سے اترنے والے چہرے فیر مکی تھے۔ احسان ہمیں بھول کر ان کے
 گرد پھرنے لگا۔ اور انہیں اپنے ہوٹل میں ٹھہرانے پر راضی کر لیا۔۔۔ وہ اپنا سالان
 کمروں میں منتقل کرنے لگے۔

ہم ایسے لا پرواہ مسافروں کی طرح تھے جو اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے اور اب
 انہیں کہیں نہیں جانا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد رانی نے اپنے بازو ملتے ہوئے کہا ”سردی ہے۔۔۔“

میر نے اپنی افغان جیکٹ رک سیک میں سے کھینچ کر باہر نکالی اور پہن لی۔
 یہ ایسا وقت تھا جب نانکا پریت کے سائے ریگتے ہوئے ترشک کی روشنی کم کر
 رہے تھے۔ ہوا نہیں تھی لیکن ترشک کے ٹھہراؤ میں، فضا کے سکوت میں ٹھنڈک
 بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لمحے ان کمروں میں سے جنہیں احسان، نانکا پریت نورسٹ کا کچ
 روپل ترشک کا نام دیتا تھا ایک خوش شکل اور مناسب مقامات پر بھری بھری خاتون
 باہر نکلی۔۔۔ اس کے کاندر سے ہر ایک چھوٹا سا تولیہ تھا اور ہاتھ میں برش جس پر مٹی
 ٹوٹھ پیسٹ کو وہ سنبھالتی چلی آئی تھی۔ اس نے ہماری طرف ذرا ناراض نظروں سے
 دیکھا اور پھر اسی دو تین فٹ چوڑی ندی کے کنارے بیٹھ کر دانت صاف کرنے لگی۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ پہلے اس نے ندی پر جبک کر منہ دھونے کی کوشش کی اور جہاں
 تھی وہیں من ہو کر رہ گئی کہ پانی بالکل برف تھا پھر اس نے منہ دھونے کا ایک طریقہ
 نکالا۔ وہ ایک ہاتھ سے منہ پر چھینٹا مارتی اور فوراً دوسرے ہاتھ میں تھامے تولیے سے
 منہ پونچھ لیتی تاکہ برفیلا پانی زیادہ دیر چہرے پر رہ کر اسے برف نہ بنائے۔ اس منظر کو
 دیکھ کر ہم نے اپنے آپ کو کچھ بے گھر اور مسکین سا محسوس کیا۔۔۔ اور ہمارے مسکین
 محسوس کرنے میں اس سردی کا بڑا عمل دخل تھا جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی چلی جاتی تھی۔۔۔ یہ
 ایسی سردی تھی جو ہمارے زرد خیمے کے سنگل کپڑے سے تو نہ رکتی تھی۔۔۔ ہمیں شب
 بری کے لیے چھت درکار تھی۔ لیکن ہم انکار کر چکے تھے اور اب یہ ہماری انا کا
 مسئلہ بن چکا تھا۔ ایک بار احسان کمروں سے باہر آیا تو میں نے ایک بست چوڑی
 مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب دیکھا۔ وہ اڑتا چلا آیا ”کمرہ چاہئے؟“

”نہیں۔۔۔ یہاں کون سی جگہ خیمے لگانے کے لیے مناسب رہے گی؟“

”سردی ہو گی صاحب۔۔۔ اور ترشک کی ساری زمین گلیشیر کے پانیوں کی وجہ
 سے نم آلود اور دہنے والی ہے۔۔۔ ہاں گراؤنڈ میں لگائیں جہاں بچے فٹ بال کھیل
 رہے ہیں۔۔۔“

”اچھا تو سردی ہو گی۔۔۔“ میں نے ذرا لا پرواہی سے ادھر ادھر دیکھا اور اس لمحے
 میرا بدن کپکپا رہا تھا کیونکہ میری جیکٹ رک سیک میں سیلینگ بیک کے نیچے دبی
 ہوئی تھی اور میں اسے نکال کر پہن نہیں سکا تھا۔۔۔

”خیر سردی تو کیا ہو گی لیکن۔۔۔ ذرا کمرہ ایک مرتبہ پھر دکھا دو۔“

احسان نے تھوڑے کے فرش پر ہمارے لیے جو تریال بچھائی وہ بھی میلی تھی۔۔۔
 لیکن یہاں باہر کی نسبت حالات خاصے بہتر تھے۔۔۔ یوں بھی ساتھ والے کمرے سے
 صاحب لوگوں کی چیخوں۔۔۔ پرست قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ ہم نے رک سیک
 کھول کر سیلینگ بیک نکالے اور انہیں میلی تریال پر بچھا دیا۔ میں نے جیکٹ پہنی تو
 اس کی گرمی نے مجھے بڑا گھبرا سکا دیا۔ جاپانی ایک گونگے غلام کی طرح ہم جو کہتے تھے
 اس پر ”آہ آہ“ سر ہلاتا تھا اور جاپانی ابھی تھوڑی سی روشنی ہے آؤ ترشک کا قصبہ
 دیکھ آئیں۔۔۔ اور نو پرائلم۔

اور باہر تھوڑی سی روشنی تھی۔۔۔ کسی مقام کو دور دراز کی مسافیں طے کرنے
 کے بعد وہاں پہنچنے پر دیکھنا اور ایسے دیکھنا کہ سالان زمین پر پڑا ہو اور شب بری کے
 لیے ٹھکانہ نہ ہو یہ اور بات ہے اور پھر اسی مقام کو اس اطمینان سے دیکھنا کہ ہمارے
 پاس واپس جانے کے لیے ایک چھت ہے جس کے نیچے ہمارا سالان محفوظ ہے۔ بالکل

اور بات ہے۔ پہلے آپ انجی ہوتے ہیں مگر نے والے اور پھر آپ اس مقام کے باسی ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں کے باسی بھی آپ کو قبول کر لیتے ہیں۔ میں اور میر اپنی چھڑیاں نکلتے ترشک کے کھیتوں میں اطمینان سے چلتے تھے۔ ہمارے ”کامیج“ کے سامنے جو سرخسی اس میں کسی پہاڑی بکرے کے سینک اٹکے ہوئے تھے۔

”یہ مارخور کے سینک ہیں ابو؟“ میر نے انہیں اپنی چھڑی سے چھوا۔

”پتہ نہیں۔۔۔ ہر طور کی بکرے کے ہیں“

”نہیں مارخور کے ہیں۔ انہیں اٹھالوں ابو؟ ترشک کے سوونتر کے طور

پر؟“

”نانکا پریت سے واپسی پر اٹھا لیتا۔ انہیں اور کوئی نہیں اٹھائے گا“

نمر کے دوسری جانب ایک چھوٹی سی پن پکی تھی۔۔۔ ایک چھوٹی سی آبشار۔ آبشار کے آس پاس جیسے درجنوں گل دان سجے ہوں۔ ایک سوکھی ٹھنیوں والا درخت۔۔۔ اور ان کے پس منظر میں ترشک کے کھیت مکان اور نانکا پریت کی سفید دنیا تھی۔۔۔ یہاں زمین واقعی نرم اور گیلی تھی۔ اور وہ فوم کی طرح پاؤں تلے دھتی تھی۔ اور اس زمین پر جہاں گھاس تھی وہاں زرد پھول تھے اور جہاں کھیت تھے ان میں جامنی رنگ کے پھولوں کی دیواریں تھیں۔۔۔ سردی میں اضافہ ہو رہا تھا۔۔۔ ہم خاصی دور تک گئے، نانکا پریت کے نزدیک ہونے کی کوشش کی۔۔۔ کھیتوں میں جہاں کچھ پتھر تھے ان پر بیٹھ کر آرام کیا۔۔۔ آرام بے حد ضروری تھا ترشک ایک گلیشیر گاؤں ہے اور اس کی بلندی تقریباً بارہ ہزار فٹ کے قریب ہے۔ یہاں ہوا بے حد کم ہے اور فوراً سانس پھول جاتا ہے اور اس کے علاوہ ہلکا سا سردی تھب تک۔۔۔ جب تک آپ بلندی کے عادی نہیں ہو جاتے۔ اس مقام پر ہم نے ترشک کے چوٹی لینڈ مارک کو دیکھا۔

ترشک کی ہرادل کے درمیان ایک نہایت بھرپور پہاڑی ہے جس کے اوپر درختوں کے تنوں اور پتھروں سے بنا ہوا ایک سیاہ اور چوکور ڈھانچہ ہے۔۔۔ یہ ڈھانچہ بہت دور سے دکھائی دیتا ہے اور اس کی تعمیر کا ڈھنگ بے حد منفرد ہے۔۔۔ یہ کیا ہے؟۔۔۔ یہ ہم کل صبح کھوج لگائیں گے کیونکہ فی الحال ترشک مکمل تاریکی کی لپیٹ میں آ رہا تھا اور پاؤں تلے کی زمین میں سے سردی بدن میں جاتی تھی اور گرم جیکٹ کو جیسے جسم سے الگ کر دیتی تھی۔

”کامیج“ کے اندر ایک اور دنیا آباد تھی۔۔۔ بے فکر فرائیسی سیاحوں کی دنیا جو

ریت پر میز سجائے اور اس پر موسم بٹیاں جلائے فرانس کے جنوبی حصوں میں تیار کی گئی انگور کی شراب پی رہے تھے اور موسم بٹیوں کی ناکانی روشنی ان کی آنکھوں میں الاؤ کی صورت جلتی تھی۔۔۔ راہی نے ہماری موجودگی میں کمرے کو رہائش کے قابل بنانے کی کوشش کی تھی۔۔۔ کھڑکی کے آگے ایک چادر لٹکائی گئی تھی۔۔۔ ہم سب کا سامان قرینے سے رکھا ہوا تھا اور۔۔۔ ایک موسم بٹی روشن تھی۔۔۔

احسان ہانچا ہوا کمرے میں آگیا ”صاحب آپ کو کھانا چاہئے؟۔۔۔“

”کھانے میں کیا ہو گا؟“ ہم نے پوچھا۔

”کھانے میں کھانا ہو گا صاحب۔۔۔ ہم گوروں کے لئے کھانا بنائے گا تو آپ کو

بھی کھلا دے گا۔۔۔ ٹھیک ہے؟“

احسان کچھ زیادہ ہی پرست نظر آ رہا تھا بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ وہ پرست طور پر پوکھلایا ہوا نظر آ رہا تھا، فرانس کے جنوبی حصوں کے انگوروں کا اثر ترشک کو بھی غمور کر رہا تھا۔

راہی اپنے طور پر ڈنر تیار کرنے کی کوشش میں تھا۔۔۔ جاپانی اپنی ڈائری لکھ رہا تھا۔۔۔ وہ ایک ریوٹ کی طرح منظم اور بے جان تھا۔۔۔ نانکا پریت کی قربت محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ ہم مکمل گرم لباسوں میں تھے اور اپنے سیلینگ بیگوں میں تھے اور اس کے باوجود ایک سرد بے چینی تھی۔

”یہ بیگ صاحب والا پچھ سنو کیسے جلتا ہے؟۔۔۔ میں تھوڑی سی وال ہالوں“

”سپرٹ کی بوتل میں سے تھوڑی سی سپرٹ سنو کے اندر ڈالو اور تھوڑی سی باہر اور پھر آگ لگا دو“

راہی نے ایسا ہی کیا اور آگ لگا دی۔۔۔ اور آگ پورے سنو کو لگی اور اس کے شعلے چھت کو چھونے لگے، ایک چھوٹی سی بجکڑ اور سراسیمگی پھیلی جس میں جاپانی ”آہ آہ“ کا شور مچا رہا تھا۔۔۔ میں ”راہی“ راہی“ کر رہا تھا اور میر ”ابو ابو“ کے نعرے لگا رہا تھا۔

خوش قسمتی سے آگ پر جلد ہی قابو پا لیا گیا ورنہ ترشک میں تو کہتے ہیں کہ قاز بریگیڈ کی سولت بھی نہیں ہے۔۔۔ البتہ اس کا روشن پہلو یہ تھا کہ راہی کی وال گل گئی۔

ہمارے فرائیسی ہمسایوں کے قہقہے مزید شوخ اور قدرے بے ربط ہوئے تو میں نے اٹھ کر ان کے کمرے میں جھانکا چونکہ اس کامیج کے ابھی دروازے بھی نہیں لگے

ہو کر کہتا تھا "آہ" اس پر میرے مجھے ایک جانب لے گیا اور کہنے لگا "ابو ہم تو میں یکپ یا لاقب تک جائیں گے اور اس جاپانی نے یوں بھی مائنو پاس جانا ہے تو اسے جانے دیں۔ احسان نے چکر تو چلایا ہے لیکن جانے دیں۔"

چنانچہ ہم نے اپنے عزیز ساتھی "آہ نور اہلم" کو بہ چشم غم رخصت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب اس کا اور ہمارا سامنا نہیں ہونا تھا۔ ہم نے نانگا پریت سے واپسی پر چلم چوکی کے راستے دیوسائی چلے جانا تھا اور اس نے گلگت واپس جانا تھا جس کے لئے اس کی جیب کی بگ بگ ہو چکی تھی۔

"پھر ملیں گے۔" میرے اسے پکارا۔

وہ ندی کے کنارے اکڑ کر کھڑا ہوا اور پورے دانت نکال کر بولا "نور اہلم" اور پھر احسان کے پیچھے چلنے لگا جو بے حد خوش خوش پھدکتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ خزانہ جی بھی اپنے پورٹرز کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔ اب ہماری ٹیم باقی رہ گئی۔ اور ندی کے کنارے دو پارٹیشن حضرات جو اپنی داڑھیوں کو کھجلاتے ہوئے بے حد لطف اندوز ہو رہے تھے باقی رہ گئے کیونکہ یہ ہمارے پورٹرز تھے۔ اگرچہ پورٹرز تھے لیکن سلطان تھے۔ ایک سلطان دلی قریبی قصبے ٹاکے کا باشندہ۔ ذرا مسکین فضل کا اور کچھ درویش صورت کا اور دوسرا سلطان محمود کسرتی جسم کا ہوشیار شخص۔ ان دونوں کے ذاتی گدھے پھولوں بھری گھاس پر کچر کچر منہ چلا رہے تھے۔ ہمارا سامان "کامیج" کے باہر ندی کے کنارے پڑا تھا۔ بیجوم ختم ہو چکا تھا اور اب ہم تھے ہمارے پورٹرز تھے ہمارے گدھے تھے اور سامان تھا۔ اور سامان میں ایک اہم آئینم انڈوں کی پوتلی تھی۔ گلگت کے بازار میں دیگر سامان خریدتے ہوئے جب ہم نے چھ عدد انڈے خریدے تو بیک صاحب کہنے لگے "ہاں آں مارڈ صاحب۔ یہ آپ کے انڈے استور تک بھی نہیں پہنچیں گے۔" اور جب استور روڈ پر دھکوں اور دھچکوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ ہمارے چھ انڈے سلامت نہیں رہیں گے۔ ان کی پوتلی جیب کی اگلی نشست کے نیچے رکھی گئی تھی اور ہماری نظروں کے سامنے کئی مرتبہ اچھلی تھی۔ ترشک پہنچے ہی ہم نے انڈے چیک کئے تو صرف ایک راستے کی صعوبتوں میں کام آیا تھا اور باقی پانچ زندہ سلامت تھے۔

"ہاں جی سلطان صاحبان۔ سفر کی تیاری کریں؟"

"ہاں ہاں۔" سلطان دلی بولا اور "ہو ہو" کرتا اپنے گدھے کو گھیرنے لگا۔

تھوڑی دیر میں دونوں گدھے پیک ہو گئے۔

"اس کا سب سے زیادہ خیال رکھنا ہے" میں نے انڈوں کی پوتلی سلطان کو تھمائی۔ اس نے اسے ڈرتے ڈرتے پکڑا جیسے اس کے اندر کوئی زہریلا سانپ ہو۔

"اس میں کیا ہے صاحب۔؟"

"انڈے۔۔۔ پانچ انڈے۔۔۔"

"نوٹ جائیں گے صاحب۔" وہ مسکراتے لگا "اور نہیں پہنچیں گے۔"

اب ہماری ساری منصوبہ بندی کچھ یوں تھی کہ ہم نے نانگا پریت کے ہیں یکپ تک جانا تھا اور یہ تقریباً ڈیڑھ دن کا سفر تھا۔ رات وادی روہل عبور کر کے ایک کلیشیر کے قریب بسر کرنی تھی۔ یوں تو نانگا پریت کے روہل سائڈ میں مختلف ہیں یکپ ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ پسندیدہ بے یک ہے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم بے یک میں ایک رات گزار کر لاقب کے میدان میں جائیں جو نانگا پریت کے دامن میں پھیلا ہوا ہے۔

یہ علاقے مسلسل بارش کی زد میں رہتے تھے لیکن آج موسم بالکل صاف تھا۔ نانگا پریت کے وسیع سلسلے میں جب بادل آ جاتے ہیں تو پھر وہ کہیں نہیں جاتے۔ وہ اس پہاڑ کو پرے تو نہیں کر سکتے اس لئے اس کی بلندیوں کے ساتھ لگ کر برستے رہتے ہیں۔ اور آخری بوند تک برستے ہیں۔ اور اس دوران سیاح اور کوہ پیما اپنے ٹیموں میں دبکے رہتے ہیں۔ تو ہمارے سفر کا آغاز روشن تھا۔

"چلیں صاحب؟" سلطان نے پوچھا اور پھر میرے سر ہلانے پر گدھوں کو "ہو" کرنے لگا۔ دونوں گدھے تربیت یافتہ تھے اس لئے فوراً گھاس سے منہ اٹھایا اور کلن کھڑے کر کے چلنے لگے۔

سفر کا یہ لمحہ بھی اپنے اندر ایک عجیب پہچان خیز شدت رکھتا ہے۔ یعنی ایک ان دیکھے اور ان جانے جہان کی جانب پہلا قدم۔ ترشک تک تو جیب آتی تھی اس لئے یہ راستے مسافروں کے عادی تھے لیکن اس سے پرے راستے نہ تھے، پگھڑیاں تھیں یا بس یہ خیال تھے کہ یہ راستے ہیں اور ان پر صرف دو چلنے کو آتے تھے جو دوسروں کے نزدیک محل خام رکھتے تھے۔ ترشک تک ایک رابطہ چلا آتا تھا۔ لیکن اس سے آگے کچھ نہ تھا ایک خلاء تھا جس میں ہم نے قدم رکھا اور اس پہلے قدم کے ساتھ جہاں ان دیکھے منظر دیکھنے تھے وہاں ان جانے خطرات کو بھی تو جانا تھا۔

اب ہمیں نیچے اترنا تھا، گلیشیر کے راستے کو پار کر کے دوسری جانب، پھر کنارے کے اوپر جانا تھا اور پار جانا تھا۔

یہ گلیشیر ٹانگا پریت کے سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ اس کی برفوں سے ملا ہوا تھا۔ لیکن ان دنوں یہاں بہت زیادہ برف نہیں تھی بلکہ سلیٹی رنگ کے پتھر بے ڈھیروں، بھر بھرے پتھروں اور سنگریزوں کا ایک تھما ہوا دریا تھا جس کے نیچے برف تھی۔ یہ برف کہیں کہیں سیاہ پتھروں کی طرح جھانکتی تھی۔ اور اس تھے ہوئے دریا میں بعض پتھر کئی منزلہ عمارتوں جتنے بلند اور وسیع تھے۔ اور یہ گذرگاہ اپنے آس پاس کے منظر سے بالکل الگ نظر آتی تھی کیونکہ برف کی سفیدی اور ترشک کی ہموالی کے مقابلے میں یہ بالکل یک رنگ تھی۔ سلیٹی اور نیم سیاہ۔

”ابو آپ کو فیری میڈو کے راستے کی وہ تصویر یاد ہے جس میں ایک بہت بلند اور خشک پہاڑ میں کہیں آپ کے سامان سے لدا ہوا ایک گدھا ہے۔ اور وہ کبھی نظر آ جاتا ہے اور کبھی پتھروں میں نظر نہیں آتا۔ اور آپ اس کو ”آئیے گدھا تلاش کریں“ تصویر کہتے ہیں۔“ میر نے اپنا لمبا بازو اٹھایا اور نیچے گلیشیر کی گذرگاہ کی طرف اشارہ کیا ”اب ذرا یہاں اپنے دو گدھے تلاش کریں“ گذرگاہ کئی سو میٹر چوڑی تھی اور میں نے بہت غور کیا لیکن وہاں پتھروں، برف کے سیاہ ٹوکیلے تودوں اور بھر بھری سی کنکروں والی مٹی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ سلیٹی رنگ کی دنیا خاموش اور بے تصویر تھی۔

”میرا خیال ہے گدھے دوسرے کنارے پر چڑھ کر دوسری جانب اتر چکے ہیں۔“

”ہوں۔“ میر نے سر ہلایا ”وہ تھی آپ کی فیری میڈو“ آئیے گدھا تلاش کریں“ تصویر اور یہ ہے میری ”واوی روپل آئیے گدھا تلاش کریں“ تصویر۔ ذرا غور سے دیکھئے ابو۔۔۔ اس بڑے پتھر کی سیدھ میں، آپ کا رک سیک سرخ رنگ کا ہے۔ آپ کو ایک سرخ دھبہ نظر نہیں آتا۔“

”نہیں آتا۔“ میں نے بہت کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ میر ذرا باندھ رہی تھی۔

”ہے صاحب۔۔۔ ہے ناں“ سلطان نے بھی دانت نکال دیئے اور اس کے اگلے دو دانت کسی تپاری کی وجہ سے آدھے رہ گئے تھے۔ اور گدھا وہاں تھا۔ گدھا تو دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن ایک سرخ دھبہ ضرور نظر

”روپل گلیشیر کے ہاتھی اور شوکور پر ایک زرد خیمہ اور سردرات“

ہم ترشک کے کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے ترشک گلیشیر کے اس کنارے کے دامن میں پہنچ گئے جو دور سے ایک عمودی دیوار کی طرح نظر آتا ہے۔ اس پر ایک راستہ اٹھتا تھا۔ مجھے ابھی اپنی جسمانی صحت کی بہتری کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ ایک شہری جسم بے حد نرم اور آرام طلب ہوتا ہے اور اس کے اندر کوہ پناہ کی مشقت کرنے کے لئے نہ قوت ہوتی ہے اور نہ خواہش۔ مجھے میں خواہش تو بہت تھی۔۔۔ سلطان محمود گدھوں کا انچارج تھا چنانچہ وہ ہم سے خاصا آگے جا چکا تھا۔ سلطان ولی اور میر اسٹے چل رہے تھے۔ میں اور راہی چھڑیاں لٹکتے اور باتیں کرتے ترشک کی جانب مڑ کر دیکھتے تھے۔ کیونکہ ہم ترشک سے اونچے ہو رہے تھے اور وہ مکمل تفصیل سے اور اپنے پورے پھیلاؤ سے ہمیں نظر آ رہا تھا۔ اور میر اور سلطان کے آگے ایک نیلے آسمان میں ٹانگا پریت کی چوٹیاں جیسے لمحہ بہ لمحہ نزدیک آ رہی تھیں۔ میں نے متعدد بار کسی پتھر سے ٹیک لگا کر اپنا بے ربط ہوتا سانس درست کیا۔ میں اگرچہ راہی کے بارے میں فکر مند تھا لیکن وہ بڑے تحمل سے اور محنت سے چلتا جا رہا تھا۔ پہاڑوں میں لاپرواہ اور شوخ ہو کر چلنے والے بہت زیادہ دیر تک اور دور تک نہیں چلتے۔۔۔ میر اور سلطان اوپر پہنچ کر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ سلطان انڈوں کی پونٹلی کو ایک بیڑے کی طرح نرمی سے پکڑے ہوئے ایک بڑے پتھر پر بیٹھا تھا۔ اور میر اپنی چھڑی کی نوک سے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو اس طرح دھکیل رہا تھا کہ وہ اس بلندی سے لڑھک کر نیچے گلیشیر کی گزرگاہ تک گرتے جاتے تھے۔

ہم ایک بڑے پتھر پر چڑھ کر چھڑیاں ٹپکتے دوسری جانب اترے تو پتھروں کے سلیٹی لمبے کے قریب ایک چھوٹا سا شفاف تالاب تھا۔ پتھروں کے نیچے سے ایک ٹالی برآمد ہوتی تھی اور تالاب میں گرتی تھی۔ پانی ایسا شفاف تھا کہ اس میں پڑے ہوئے پتھر اور سنگریزے کسی شیشے میں منجمد لگتے تھے۔

”ابو میں ذرا اس جھیل کو قریب سے دیکھ لوں؟“

”یہاں سے دکھائی نہیں دے رہی؟“

”میں اس کے پانی میں اپنی چھڑی ڈبونا چاہتا ہوں — اور ہاتھ بھی لگانا چاہتا

ہوں“

میرے سر ہلانے پر وہ پتھروں کو پھلانگتا اس تالاب تک چلا گیا۔ وہ نیچے جھکا ”ابو اوھر جہاں سے پانی آ رہا ہے وہاں اندر بالکل اندھیرا ہے اور برف ہے اور اوھر دیشیں تو کیا لٹھڑی لٹھڑی ہوا آتی ہے۔“

”بچے واپس آ جاؤ“

بچہ واپس آ گیا۔

پوشیدہ برف کے اس انہار پر چلنے کے باوجود اوپر جو دھوپ تھی وہ بدن جلاتی تھی اور ہینڈ چرے پر آتا تھا اور پھر سرد ہوا چل کر سرد گرم کرتی تھی۔ گزرگاہ کا اختتام ہوا آگے دوسرا کنارہ تھا۔ دوسری دیوار تھی اور یہ کچی بھر بھری اور سیدھی اوپر کو جاتی تھی۔ ایسے مقامات پر اگر آپ میں جھجک پیدا ہو تو مقامی لوگ کہتے ہیں ”صاحب ڈرتے کیوں ہو اوھر سے تو بچہ اور بکری بھی گزرتا ہے۔“ اور یہ مقامی لوگ آپ کو یہ بھی نہیں بتاتے کہ اوھر سے گزرتے ہوئے کتنا بچہ اور بکری نیچے گیا۔ شمالی علاقوں میں میں نے کئی جگہ مارخور کے ڈھانچے دیکھے ہیں اور یہ وہ مارخور ہوتے ہیں جو کسی چٹان سے پھسل کر وادی میں آگرتے ہیں۔ اور مارخور کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا کسی چٹان سے گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سلطان بھی کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ کہنے لگا ”صاحب خطرناک تو ہے پر گزر جاؤ۔ راستہ ٹھیک ہے“

”میں پہلے جاتا ہوں“ میں چھڑی ٹیکتا اس بھر بھری مٹی اور سنگریزوں پر ہما جاکر قدم رکھتا اوپر چڑھنے لگا۔ یہاں آپ جو چاہیں کر لیں آپ کا پاؤں سنگریزوں پر سے اس طرح پھسلتا تھا جیسے آپ نے ردلر سیکش پنے ہوئے ہیں۔ اور سنگریزے سیدھے بکیشیر کی گزرگاہ پر گرتے تھے۔ یہاں جان کا خطرہ تو کم تھا لیکن نیچے جانے کی

آگیا۔ تو ہم خاصی بلندی پر تھے اور ہمیں نیچے جانا تھا۔ اور ہاں۔ بکیشیر سے دوسری جانب ایک خشک پہاڑ تھا جس کے واسن میں ایک سرسبز علاقہ اور درخت تھے اور پس منظر میں ایک برف پوش چوٹی نظر آ رہی تھی۔

”وہ روپل ہے۔“ سلطان نے انڈوں والی پوٹلی سے اوھر اشارہ کیا۔

”اگر وہ روپل ہے تو یہیں سے واپس چلیں۔“ میرے ذہن میں روپل کی وادی کچھ اور تھی اور یہ تو کچھ بھی نہ تھی۔

”اور صاحب یہ اوھر پہلے چھوٹا روپل ہے اور اوھر ذرا بلندی پر بڑا روپل ہے۔ ہم اوھر جائیں گے پھر دریا پار کر کے اس پہاڑ پر چڑھ جائیں گے اور اوھر جو بکیشیر کا منہ نظر آتا ہے اس کے پاس آج رات کیمپ کریں گے۔“

ہم نیچے اترنے لگے۔ یہ ایک چھوٹا سا بل کھاتا راستہ تھا جس پر چلنا مشکل تھا اور لڑھک جانا بہت آسان۔ اور مجھے سمیر کا فکر تھا۔ سمیر بچپن میں زمین پر مضبوطی سے پاؤں نہیں رکھتا تھا بلکہ قدرے لاپرواہی سے چلتا تھا اور اکثر اوھر اوھر لڑھک جاتا تھا اور اس مناسبت سے اسے لڑھکو خاں بھی کہا جاتا تھا۔ اب ہم ایسے خطوں میں تھے جہاں یہ عادت زیادہ مفید نہیں تھی اور میں اس کے بارے میں فکر مند تھا۔

”تم میرے آگے چلو سمیر“

اس نے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا اور پھر کسی پختہ قدم پہاڑی ٹھہر کی طرح نیچے اترنے لگا، البتہ میرے پاؤں ذرا بے قابو ہوتے تھے اور گھٹنے آہیں میں بھرتے تھے۔ نیچے جاتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ بکیشیر کی گزرگاہ کے پار دوسرے کنارے پر ہمارے گدھے حرکت کر رہے تھے۔ نیچے اترتے ہوئے ہمارے کانوں میں بکیشیر کی توڑ پھوڑ کی آوازیں قریب ہوئیں۔ ان کے ساتھ پانی کے رسنے اور ٹپکنے کی آواز تھی اور ایک لٹھڑک تھی، ہمارے نیچے ہزاروں برسوں سے منجمد برقیں تھیں۔ ہر برس نانگا پریت سے برف کھسک کر اس گزرگاہ پر آتی تھی اور اپنے ساتھ لائے ہوئے پتھروں اور چٹانوں سے الگ ہو کر پھسل کر نیچے دریائے روپل میں جا ملتی تھی۔ ہم اس گزرگاہ میں داخل ہوئے تو جیسے کسی خفیہ عبادت گاہ میں داخل ہوئے۔ یہاں کوئی نہ تھا صرف پانی کی مدھم آواز تھی ٹپکنے اور ٹپکنے کی۔ کہیں کہیں بکیشیر کی بو تھی نظر آ جاتی اور اس کے نیچے چھوٹے چھوٹے تالابوں میں پانی ٹپکتا دکھائی دیتا۔

صورت میں آپ کے ایک چارپائی پر لٹا کر واپس ٹھکت لے جانے کا امکان ہے حد قوی تھا۔ ہمیں جو ماتھے پر حیرتا آنکھوں میں گرتا تھا اسے پونچھنے کی کوشش میں بیلنس خراب ہو سکتا تھا اس لئے ہمیں آنکھوں میں گر کر آپ کے سامنے راستے کو دھندلاتا تھا۔ کنارے کے اوپر پہنچ کر میں نے ہمیں پونچھا اور نیچے کھڑے سمیر سے کہا کہ بس بیٹے بے حد احتیاط سے آجاؤ۔ وہ جھکا ہوا اس دیوار پر چڑھنے لگا اور اس کے ساتھ میرا سانس بھی بند ہو گیا کہ وہ بہت پھسلتا تھا۔ ایک جگہ اس نے قدم رکھا تو اس سے سنبھلا نہ گیا اور وہ کرتے کرتے پچھا۔

”وہیں ٹھہرو“ میں چیخا۔ ”سلطان اس کے آگے آکر اس کا ہاتھ پکڑو“

سلطان فوراً آگے آیا اور وہ بھی پھسلتا ہوا آیا اور اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ اس دوران سمیر بالکل بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ وہ خاصا خوفزدہ تھا لیکن مجھ سے زیادہ نہیں تھا۔ سلطان کا ہاتھ تمام کر وہ ہولے ہولے سانس روکے چڑھنے لگا۔ بھرپوری مٹی مسلسل اس کے قدموں میں سے نکل رہی تھی۔ ایسی مٹی اور سنگریزوں پر چڑھنے کا اصول یہ ہے کہ آپ تیزی سے اوپر جاتے ہیں اور جتنی دیر میں آپ کا پاؤں پھسلے لگتا ہے اتنی دیر میں آپ اسے اٹھا لیتے ہیں۔ لیکن اس طرح کی تیزی دکھانے کے لئے ہمت اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب وہ دونوں قریب ہوئے تو میں نے اپنا ہاتھ آگے کیا لیکن سمیر کی نظریں بدستور نیچے راستے پر تھیں اور اس نے سر ہلا کر کہا کہ نہیں مجھے سارے کی ضرورت نہیں۔

اوپر پہنچ کر اس نے اپنا ہیٹ اتارا جس پر اس نے ”سپر سٹار سمیر“ کے الفاظ لکھے ہوئے تھے اور بالوں میں ہاتھ بھیر کر ذرا غصے سے کہنے لگا ”ابو میں اچھا بھلا آ رہا تھا لیکن آپ نے یہ کہا کہ بیٹا احتیاط سے۔ تو میں گھبرا گیا آئندہ آپ نے مجھے یہ بالکل نہیں کہنا کہ بیٹے احتیاط سے“

”جب تک میں تمہارا باپ ہوں تب تک تو میں یہ کہتا رہوں گا کہ بیٹا احتیاط سے۔“ میں نے اسے بھی ڈال کر سینے سے لگایا اور تھپکا۔ لیکن اندری اندر میں نے اس کے تھمس کو درست جانا کہ میں نے جب کہ وہ بے خطر آ رہا تھا اسے احتیاط کا مشورہ دے کر خوف سے تعارف کروا دیا تھا اور جھجک کو شامل کر دیا تھا۔

بکیشیر کے اس کنارے کے دوسری جانب ایک باقاعدہ ڈھلوان راستہ تھا جس کے دونوں جانب درخت تھے اور جنگلی گلاب کی جھاڑیاں تھیں۔

”تھوڑی دیر کے لئے رک جائیں۔“

”ہاں ناں۔“ سلطان نے سر ہلایا ”پر ادھر درختوں کے پاس چشمہ ہے ادھر رکیں گے۔“

ہم نیچے آئے اور ہمارے آگے وادی روہل کے درمیان میں ایک راستہ تھا اور راستے کے دونوں جانب کھیت تھے۔ یہاں ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں وہ چشمہ تھا جہاں پہنچ کر تمام مسافر اور ٹریکروم لیتے ہیں اور اس کے ٹٹھے پانیوں سے سیر ہو کر آگے چلتے ہیں۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا اور پھر جھجک کر اپنا چہرہ جھٹسے کے پانی میں ڈبو دیا۔ اس کی خشکی چہرے کے راستے میرے بدن میں اترنے لگی اور جب میرے ہونٹ اور ناک سن ہوئے گئے تو میں نے چہرہ پانی سے اٹھا کر جھٹکا۔ اور اس لمحے روہل کی ہوا نے میرے غم اکھڑ چہرے پر خشک اور سرسراتے ہوئے سانس لئے اور اسی لمحے میں نے پہلی بار روہل کو دیکھا۔

روہل کو میں نے اگست کے پہلے دنوں میں دیکھا اور اگست کے پہلے دنوں میں روہل گھنے سبز رنگ کے کھیت ہیں جن میں ہلے ہلے پتھر کی جلابانی باغ کی طرح سجے ہیں اور ان کھیتوں میں پانی بہتے ہیں اور ان پانیوں کے کنارے جامنی رنگ کے پھولوں کے انبار ہیں۔ کھیتوں کی ہریاں ایسے ہے جیسے کسی اسپرٹسٹ۔ مصور نے اپنے کیونس پر بنیاد کے طور پر سبز رنگ لگایا ہے۔ اور پھر ان کھیتوں میں اور اس سبز کیونس پر اتنے زیادہ پھول ہیں۔ رنگوں کی بوندیں اتنی بہتات میں ہیں۔ پھولوں کی بارش کے چھیننے اتنے زیادہ ہیں اتنے زیادہ ہیں کہ انسان یقین نہیں کرتا اور منہ کھول کر اس وادی کو دیکھتا رہتا ہے جو دور سے بے حد ویران اور سنسان سی لگی تھی۔ اور اب اس وادی کے کھیتوں میں لکڑی کے گھر ہیں جو پھولوں بھرے کھیتوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ اور کھیتوں میں خواتین ہیں جن کے لباس انہی شوخ رنگوں کے ہیں جو ان کے آس پاس خشک ہوا میں جھومتے ہیں۔ عورتوں نے شوخ رنگوں کی لمبیاں بھی پہن رکھی ہیں۔ کھیتوں میں سبز کے علاوہ تین رنگ نمایاں ہیں ”سرخ“ زرد اور جامنی۔ سرخ گلاب، زرد چٹیلے پھول اور جام جھالوں والے گھٹے۔

ہم اس وادی، رنگ و بو میں چلنے لگے۔

نکلے تیری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

روہل کے پس منظر میں پہاڑ پچکے رنگ کے ہیں اور کم بلندی کے ہیں لیکن۔

اوجھر آ جاتے ہیں۔ کاشتکاری کرتے ہیں، فصلیں کاٹتے ہیں اور شدید بر فباری سے پشتر واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان دنوں تر شک اور چورت میں موسم خوشگوار ہوتا ہے بس یہ ہے کہ سردیوں میں روپل برف تلے دب جاتا ہے اور کچھ نظر نہیں آتا اور تر شک میں بھی سب کچھ دب جاتا ہے لیکن انسان کہیں کہیں نظر آتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔ میں نے ایک بار سلطان سے کہا کہ تم تو دعائیں کرتے ہو گے کہ یا اللہ اس بار برف کم پڑے تاکہ زندگی آسان ہو۔ وہ کہنے لگا، نہیں صاحب ہم تو زیادہ برف کی دعائیں کرتے ہیں، جتنی زیادہ برف پڑے گی اتنی ہی پگھلے گی اور اتنا ہی زیادہ پانی ہو گا ہمارے کھیتوں کے لئے اور ندیوں کے لئے۔۔۔

روپل گاؤں میں صرف چند گھر تھے۔ باقی گھر پوری وادی میں کھیتوں کے ساتھ تھے۔

دائیں جانب وہی سوکھا ٹیلا نما پہاڑ اور بائیں جانب کھیتوں کی آخری حد کے نیچے دریائے روپل بہتا تھا جو یہاں سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔

روپل میں ہمیں خبر ملی کے بے یک ہیں کیپ سے جو راست ٹاپ میدان اور لاقو بو جاتا ہے دھوپ سے نرم پڑتی ہوئی برف کی وجہ سے خطرناک ہو گیا ہے اور اب اوجھر سے جانا مناسب نہیں۔

سلطان زمین پر بیٹھ گیا، اوجھر ٹانگا پریت ہے۔ اور یہ اس کے نیچے بے یک ہے ہیں کیپ جہاں ان دنوں ایک جا پانی ٹیم کیپ کر رہی ہے۔ اور اوجھر ٹاپ میدان اور لاقو بو کے ہیں کیپ ہیں۔ ان کا آپس میں راستہ تو ہے لیکن وہ کھیشیر نرم پڑ گیا ہے۔ اگر ہم بے یک جاتے ہیں تو ٹاپ میدان اور لاقو بو جانے کے لئے پھر واپس روپل آئیں گے اور پھر یہاں سے آگے۔ تو بولو کو کدھر جائیں؟

”لاقو بو اور ٹاپ میدان۔“

میں نے بہت سارے کوہ چاؤں سے ان مقامات کے بارے میں بے حد تو مبینی کلمات سنے تھے۔ اور وہاں پہنچ کر ہم بے یک جانے کی کوشش بھی کر سکتے تھے۔

روپل کی آبادی ختم ہو گئی۔ ایک پہاڑی ٹالہ راستے میں آیا جس کے پانی میں قدم رکھنے کو پتھر تھے۔۔۔ ذرا نیچے ککڑی کے ہموار پتھروں والے درجنوں مکانوں کا مجموعہ نظر آیا۔ یہ مکان جیسے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ شدید سردی کی وجہ سے ساتھ ساتھ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے۔۔۔ یہ بڑا روپل یا اپر روپل تھا جو

یہاں پس منظر کی طرف نظر نہیں جاتی انسان زمین کو دیکھتا جاتا ہے اور زمین پر شوخ رنگوں کے چھینے ہیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والی خواتین ہمارے بارے میں تجسس رکھتی ہیں، وہ اپنا کام بھول کر ہمیں دیکھنے کے لئے ککڑی ہو جاتی ہیں اور جب ہماری نظریں ان کے دیدہ زیب گنوں اور خوش رنگ لباسوں کی طرف جاتی ہیں تو وہ اپنے آپ کو کھیتوں میں چھپا لیتی ہیں۔ اور ان کا چھپنا آسان ہے کہ وہ ان کے لباس اور ان کے کھیتوں کے پھول یک رنگ ہیں۔ یہاں درخت بہت کم ہیں اور اسی لئے تنہا چار میل لمبی یہ وادی پوری کی پوری اپنے تمام رنگوں کے ساتھ آپ کے سامنے پھیلی نظر آتی ہے۔

جس راستے پر ہم چل رہے ہیں اسی راستے پر تین خواتین چلی آ رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کی سرخ چادر ذرا ہوا سے اوپر اٹھی ہے تو کسی کھیت کا حصہ ہو جاتی ہے کہ وہاں بھی سرخی مائل باریک پھولوں کی تہہ بھی ہوئی ہے۔ ہم ان خواتین کو قریب سے دیکھنا چاہتے ہیں لیکن وہ ہمیں دیکھ کر راست بدل لیتی ہیں۔

راہی جو مسلسل تصویریں اتار رہا تھا یکدم کھڑا ہو گیا، ”مالی فریڈ۔ میں برباد ہو گیا۔ تم نے مجھے ہلاک کر دیا۔ میں اب تک جو دنیا دیکھتا رہا وہ کیا تھی اور اب میرے سامنے جو دنیا ہے یہ کیا ہے، سب سے بڑا مصور وہی ہے اوپر والا۔ کیا رنگ لگائے ہیں اس نے۔ فرسٹ کلاس“

لاہور میں جب میں اور میر سر جوڑ کر اس سفر ٹانگا پریت کی منصوبہ بندی کرتے تو بار بار روپل کا ذکر آتا۔ اس پر بقیہ گھر والے میر کو چھیڑتے کہ اچھا روپل جاؤ گے۔ اور اس کا نام ہی مسٹر روپل پڑ گیا۔ اسی حوالے سے میر نے رک کر صرف اتنا کہا ”ابو میں روپل میں ہوں۔ مسٹر روپل“

ہم تر شک سے سرسری گزرے تھے اور روپل سے اس سے بھی زیادہ سرسری گزر رہے تھے۔ یہ ان جگہوں سے نا انصافی تھی۔ ہم واپسی پر یہاں رکیں گے ہم نے فیصلہ کر لیا۔

ہم جس راستے پر تھے اس کے دونوں جانب پتھر جوڑ کر چھوٹی چھوٹی دیواریں اونچی کی مٹی تھیں اور ان دیواروں کے ساتھ کھیت تھیں۔ پھر کھیتوں کی بجائے گھر شروع ہو گئے۔ انہیں فارم ہاؤس کہنا زیادہ مناسب ہو گا کیونکہ روپل دراصل چورت اور تر شک کے رہنے والوں کا سر کیپ ہے۔ وہ اپنے مال موٹھی سمیت گرمیوں میں

ان دنوں بالکل ویران پڑا تھا۔ بیشتر جھوپڑے کھلے پڑے تھے۔ کواڑ بند تھے۔ کواڑوں کے اندر اندھیرے کمرے تھے جن میں خلغم اور ساگ سٹور کئے گئے تھے۔ ان مکانوں کے برآمدوں میں بھی انہیں دو سبزوں کو سکھانے کے لئے ہاروں کی طرح گوندھ کر لٹکایا گیا تھا۔ ہم ان ویران مکانوں کی چھتوں پر چلتے تھے لیکن احتیاط کے ساتھ۔ ان کی چھتوں میں چوکور روشن دان تھے۔

اوپر روپل میں ایک مرتبہ پھر دائیں ہاتھ پر ٹانگا پرست کا برنٹلا حجم ظاہر ہونے لگا۔ اور یہی اس سلسلے کی بلند ترین چوٹی تھی۔

اور ہمیں بائیں ہاتھ پر نیچے اتارنا تھا اور دریائے روپل عبور کر کے دوسری جانب شوکور تک جانا تھا۔ شوکور روپل کے مشیر کے عین اوپر واقع ہے اور اس کے معنی سفید پہاڑ کے ہیں۔ اور اسی سفید پہاڑ پر ہم نے آج کی شب بسر کرنا تھی۔

ہم اوپر روپل کے آخری کمرے آگے گئے اور پھر خلیب میں بتے تیز و تند روپل دریا کی طرف اترنے لگے۔ یہ اترائی بھی ایک دیوار کی طرح نیچے جاری تھی لیکن راستہ چوڑا تھا اور زمین سخت تھی۔

دوپہر ہو رہی تھی۔

"سلطان۔" "راہی نے سوکتے لیوں پر بہانہ پھیرتے ہوئے کہا "مائی فرینڈ کچھ کھانا پینا ہو جائے۔ کچھ وال بھات ہو جائے۔"

"ہاں ناں۔" سلطان نے خوش مزاجی سے سر ہلایا "نیچے چشمہ ہے۔ اور مینڈہ کر کھائیں گے ناں۔"

اب ہم نے دیکھا کہ ہمارے گدھے ہمارے دوسرے سلطان کے ساتھ دریا کے پار پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں "یہ دلی نہیں کھائے گا؟"

"کیا کرے گا۔" سلطان نے لاپرواہی سے کہا "یہ اور پہنچے گا شوکور میں اور ہمارا انتظار کرے گا"

ہم روپل اور ٹانگا پرست سے اوچھل ہو کر نیچے چلے گئے۔ نیچے بڑے بڑے پتھر اور بلند درخت تھے جن کے بیچ میں گھاس کے قلعے تھے۔ ہم صحن سے بے حال ہو کر درختوں کے سائے میں لیٹ گئے۔ یہاں صرف دریائے روپل کی تیزی کا مدھم شور سنائی دیتا تھا یا پھر کسی درخت کے جوں میں پوشیدہ صرف ایک پرندے کی کوکل نما آواز۔ کو او۔ کو او۔

راہی نے شوہر چلایا اور چاول ابلانے لگا۔ سلطان نے اوپر اوپر سے کھڑیاں جمع کر کے ایک دھکی چولہا بنایا اور میرے لئے کافی تیار کرنے لگا۔ سیر اپنی چھانی لوہی منہ پر رکھ کر اونگھنے لگا۔

دو پتھروں کے اوپر ایک بہت بڑا پتھر اس انداز میں آن رکھا تھا کہ اس کے نیچے بارش اور دھوپ سے محفوظ کمرہ سا بن گیا تھا۔ یہ رات گزارنے کے لئے بہت شاندار جگہ تھی اور یہاں سے بہت لوگ گزرے قیام کیا اور چلے گئے۔ تم نہ پہلے ہو نہ آخری۔

کھانے کے فوراً بعد ہم پھر چلے گئے۔ مزید نیچے اترے اور دریائے روپل پر پہنچے ہوئے اس پل تک پہنچ گئے جو تین چار شہتیروں کو آگے پار لٹا کر تیار کیا گیا تھا۔ "آہ۔" ویری ڈیجرس "راہی کمر پر ہاتھ رکھ کر اپنے جلابانی سوراخے انداز میں کھڑا ہو گیا۔

"دھر سے تو گدھا بھی گزر گیا" سلطان نے دانت نکال کر کہا۔

"ہم گدھا نہیں ہے" راہی نے مکمل سنجیدگی سے اعلان کیا "تارڑ صاحب اس آدمی کو انفرمیشن دو کہ ہم گدھا نہیں ہے۔"

"ہم دونوں گدھا نہیں ہے۔" میں نے سلطان کو اطلاع دی

"ہم تو ہے۔" یہ آواز سیر کی تھی جو سر نیچا کر کے بے سہ قدم رکھتا شہتیروں کے درمیان جو بڑے بڑے سوراخ تھے اور جن میں سے دریا کی جھاگ اوپر آتی تھی ان سے پچتا پل کے پار جا رہا تھا۔

"پھر تو ہم بھی ہے۔" راہی نے انگلی کھڑی کر کے کہا اور پل پر قدم رکھ کر زور سے دہرایا کہ گرتا تو نہیں اور پھر اطمینان کر کے آرام سے چلے لگا۔

"مگر سب ہے تو ہم بھی ہے۔" اور سب سے آخر میں میں نے قدم رکھا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے صرف میرے قدم رکھنے کی وجہ سے دریا کی پتھار میں اضافہ ہو گیا ہے کہ اسے تم بھی ہوئیں۔

دریا کے پار ایک راستہ اوپر کو بل کھاتا جا رہا تھا لیکن یہ ہریادوں میں تھا اور جنگلی بوٹیوں اور چڑھ کے درختوں میں سے تھا۔ اور یہاں ڈھلوانوں پر پھول بھی نکلتے تھے۔ ہمارے بائیں جانب ایک خاص بلندی کے بعد درخت کم تھے اور یہ سنو لائن تھی۔ اس بلندی کے برابر سفید برج کے ٹیڑھے میڑھے درختوں کا ایک جنگل ڈھلوان

پر جھکا ہوا تھا۔ دائیں جانب دریائے روہل نیچے رہ گیا تھا بلکہ وہ بہت نیچے تھا اور اس کی آواز اب ہم تک نہیں پہنچتی تھی۔ ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے تھے تو وادی روہل ایک ہوائی منظر کی طرح نظر آتی تھی۔ اپر اور لوئر روہل اور ان سے پرے ترشک کشیشیر کی دیوار۔ کیا ہم سچ سچ انا قاصلے کر کے یہاں تک پہنچے تھے؟

ہماری پگڈنڈی چھوٹی ہو رہی تھی اور بہت سی تیزی سے بلند ہو رہی تھی۔ اور سورج بھی زرد ہونے لگا تھا۔

ہم آرام کرتے۔۔۔ سانس درست کرتے۔۔۔ چوٹم چباتے چلتے گئے۔

ایک مقام پر پگڈنڈی جو پہاڑ کے ساتھ چٹی ہوئی تھی بل کھاتی ہوئی اٹھی اور کچھ زیادہ ہی اٹھ گئی۔ میں احتیاط سے آگے بڑھا تو یکدم احساس ہوا کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔ میرے سین نیچے ہزار فٹ نیچے روہل کشیشیر میں سے لٹکا ہوا تیز دریا تھا اور اس کے پانیوں میں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے آپس میں جنگلی بھینسوں کی طرح ٹکرا رہے تھے اور ڈکرا رہے تھے۔ یہاں کسی قسم کی کوئی مچھلائش نہ تھی۔

”چلو ہاں۔“ سلطان میرے پیچھے کھڑا تھا اور یہاں اتنی جگہ نہ تھی کہ میں مڑ کر دیکھ سکتا۔۔۔ سامنے وہ دس بارہ فٹ کا ٹکڑا تھا جو بل کھاتا کشیشیر کے سین اوپر معلق تھا۔

نیچے نہیں دیکھو تو خطرناک نہیں ہے۔“ یہ سلطان کی آواز تھی۔

عجیب احمق انسان تھا بھلا نیچے کس طرح نہ دیکھو۔۔۔ جیسے آپ ایک دو فٹ چوڑی میز پر یا آسانی کھڑے ہو جاتے ہیں اور سارا دن کھڑے رہ سکتے ہیں لیکن اگر اسی میز کے پائے دو ہزار فٹ بلند ہو جائیں تو کیا اس پر آس پاس دیکھے بغیر کھڑا رہتا ممکن ہے۔۔۔ یہی صورت حال یہاں تھی۔ میں وہاں سے گزرا لیکن یقین کیجئے کہ وہاں سے گزرتے ہوئے میں تھوڑا سا اس جہاں سے بھی گزرا۔۔۔ دوسری جانب پہنچ کر میں نے سمیر پر نظریں جما دیں۔۔۔ میں اسے ’یٹا احتیاط سے‘ کہنے کو تھا لیکن بہتر یہی جانا کہ نہ کہوں اور وہ پورے دھیان سے لیکن بے خطر ہو کر اتنے صبر میں سے گزر کر میرے پاس آگیا۔

ہم اپنے رات کے پڑاؤ شوکور پہنچے تو دھوپ ڈھل چکی تھی۔

ہمارے دائیں ہاتھ پر نیچے کسی اور جہاں میں وادی روہل کا سرسبز ٹکڑا تھا۔ اپر روہل آدھا سائے میں تھا اور لوئر روہل ابھی دھوپ میں روشن تھا۔ ہم ایک کشیشیر

کے نزدیک اور دوسرے کشیشیر سے ہزاروں فٹ اوپر پہاڑ کے ساتھ ایک چھوٹے سے بڑھاؤ پر اترتے تھے اور یہ چھوٹا سا حصہ اس طرح معلق تھا کہ تیز ہوا کے ساتھ ہلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

روہل کشیشیر کی قدیم برف اپنی ٹوٹ پھوٹ اور سیاہی کے ساتھ عجیب منظر تھی۔۔۔ جیسے ہزاروں ہاتھی سر جوڑے کھڑے زور لگا رہے ہیں اور برف کے ٹوٹے توڑوں کے نیچے دریا میں گرنے کی آواز اٹھی جانوروں کی ہے۔۔۔ ہم انہی زور لگاتے ہاتھیوں کے سین اوپر کھڑے تھے۔۔۔ ہمارے آگے ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا اور اس ٹیلے سے چھوٹے پتھر نیچے گرتے تھے اور اسی ٹیلے سے پرے ٹانگا پریت تھی۔۔۔ زور لگاتے بریلے ہاتھیوں کے اوپر ٹانگا پریت۔۔۔ ٹانگا پہاڑ۔۔۔ دیا میر۔۔۔ پہاڑوں کا بادشاہ شل کھی۔۔۔ سو چروں والا پہاڑ۔۔۔ اور ٹکڑا مائنٹین۔۔۔ قاتل پہاڑ۔

سلطان محمود گدھوں پر سے سامان اتار کر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

زرد خیمے کا کپڑا زمین پر بچھا ہوا تھا۔

جب ہم کشیشیر کا کوئی ٹکڑا اپنی قدیم آماجگاہ سے ٹوٹ کر دریا میں گرنا تو گز گزائٹ کی گونج میں ہمیں اپنی خیمہ گاہ لرزتی ہوئی محسوس ہوتی۔۔۔ راہی میری جانب دیکھا اور میں اس کی طرف۔

”مائی فرینڈ مجھے یہ نہ بتانا کہ ہم اس۔۔۔ کانپتی ہوئی جگہ پر رات گزاریں گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مائی فرینڈ۔۔۔ میں تمہیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بتا سکتا۔“ میں نے بے چارگی سے کندھے سیٹھریے۔

”آؤ آج کی رات گزارنے کے لئے ہم ٹانگا پریت کے دامن میں اپنا خیمہ نصب کریں۔۔۔ میٹھیں دھیان سے گاڑنا کہ یہاں رات کو ہوا تیز ہوگی۔“

پتھروں کی ایک چھوٹی سی دیوار کی اوٹ میں سلطان کھانا پکانے کے لئے آگ جلا رہا تھا اور اس کا دھواں اوپر اٹھ رہا تھا۔ اور زرد خیمہ تھا اور شب تھی جو قریب تھی اور جنگلی بوئیں کی مہک کشیشیر کے ٹوٹنے کی آواز اور دریا کا شور اور سردی تھی جو رگ و پے میں اترتی تھی اور دھوپ تھی جو ڈھل چکی تھی اور ہمارے سامنے ٹانگا پریت تھی اور ہم تھے اور صرف ہم تھے اور اسے دیکھتے تھے اور کوئی نہ تھا اور ہم

اتنی دور سے اسے دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ اور اسی لئے وہ بے لباس تھی، صرف ہمارے سامنے تھی، ہماری تھی۔

چٹروں کی ایک چھوٹی سی دیوار کی اوٹ میں سلطان کھانا پکانے کے لیے آگ جلا رہا تھا اور اس کا دھواں اوپر اٹھ رہا تھا۔ اور زرد خیمہ تھا اور شب تھی جو قریب تھی۔

ہوا کے زور سے خیمے کا پردہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ راہی ایک چھوٹے سے چتر کے ساتھ ڈھیلی میٹوں کو نکال کر دوبارہ مضبوطی سے زمین میں گاڑ رہا تھا۔

سلطان محمود نے گدھوں کی پشت سے پلانے اتارے اور انہیں ایک بڑے چتر پر رکھ دیا۔ ”یہ صوفہ بن گیا ہے۔“ اس نے ایک گدھے کو باندھ دیا اور دوسرے کو کھلا چھوڑ دیا ”یہ والا گدھا بد معاش ہے بھاگ جاتا ہے۔ اور یہ شریف ہے کہیں نہیں جائے گا۔“

ہم جہاں تھے وہاں صرف کنارے تھے۔ دائیں ہاتھ پر جہاں سے آئے تھے، چند میٹر جگہ پر چتر بکھرے ہوئے تھے اور وہاں سے روپل پیچے تھا اور ہم میں کسی نے بھی بالکل کنارے پر کھڑے ہو کر نیچے جھانکنے کی کوشش نہ کی۔ خیمے کے سامنے ایک دو تین میٹر اونچا ٹیلا تھا جس پر ایک جھاڑی تھی اور وہاں بمشکل ایک آدمی کے بیٹھنے کی جگہ تھی اور اگر وہ آدمی بیٹھ کر گردن آگے کر کے دیکھنے کی کوشش کرے تو وہ گردن سمیت نیچے جاتا تھا۔ کیونکہ نیچے عین نیچے روپل گھیشیز اور دریا کی وحشت تھی۔ ایک مسلسل شور تھا۔ میں یہیں سانس روکے بیٹھا تھا اور کافی کا تک میرے ہاتھ میں تھا اور اسے ہونٹوں تک لاتے ہوئے بھی احتیاط برتا کہ کہیں اتنی حرکت بھی مجھے نیچے نہ لے جائے۔

”ابو میں بھی آ جاؤں۔“ میری آواز آئی۔

”نہیں۔“ میں نے پیچھے دیکھے بغیر جواب دیا۔

”پھر آپ بھی واپس آ جائیں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

میں اپنا وزن پیچھے کی طرف رکھتا ہوا نیچے آ گیا۔ ہماری خیمہ گاہ ترشک سے ٹانگا پرست جانے والے کوہ پناؤں اور کوہ نوروں کے لئے شب بھری کا کام دیتی تھی اور بھی پورے اسے فرسٹ شاپ کہتے تھے۔ چٹروں کی دو چھوٹی چھوٹی چار دیواریاں اس امر کی غمازی کرتی تھیں کہ ان کے اندر ایک ایک خیمہ نصب ہو سکتا تھا اور

یہاں ہوا سے بچاؤ بھی ہو جاتا تھا۔ اس قسم کی ایک چار دیواری کی اوٹ میں سلطان کھانا بنا رہا تھا۔ چاول۔ دال اور ٹہن بند کھاتے۔

”یہ شوگر ہے؟“ میں نے سلطان سے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔“ اس نے دھواں لگی نم آنکھوں سے میری جانب دیکھا۔

”لیکن شوگر تو سفید پھاڑ کو کہتے ہیں۔ سفید پھاڑ کہاں ہے؟“

”یہی ہے۔“ اس نے کہا۔ لیکن مجھے دو تین چٹروں کے علاوہ اور کچھ

دکھائی نہ دیا۔ وہاں شوگر میں رات ہوئی تو یکدم ہوئی اور اس حساب سے سردی آئی کہ ہم جیسے کسی ڈیپ فریزر میں سانس لینے لگے۔ میرا اپنی پٹھانی ٹوپی کانوں پر کھینچے ہوئے بولا ”اُدھر گھیشیز اُدھر گھیشیز تو اُدھر جے گی قلفی۔ کوئی قلفی؟ کھوئے والی ملائی والی ٹھنڈی ٹھارے۔“ اس نے لاہوری قلفی فروشوں والی ہیک لگائی۔

”اُدھر نیچے تو روپل گھیشیز لیکن اُدھر کدھر گھیشیز؟“

”اُدھر ان چٹروں کی اوٹ میں ایک اور گھیشیز میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں۔“

”تم اُدھر کیا کرنے گئے تھے؟“

میرا جو کہ بچہ تھا اگرچہ لم ڈینک ہو چکا تھا بچوں کی طرح مسکرایا۔ ”میں۔۔۔ پانی کرنے گیا تھا۔“

”تو پھر؟“

”پھر کیا؟ گھیشیز پر بیٹھنے سے قلفی جم گئی۔“

کھانے کے بعد الاؤ روشن کیا گیا۔ اور ہم سب اس کے گرد ہتھیلیاں پھیلائے

بیٹھ گئے۔ اور پہلی بار ایک دوسرے کو بتایا کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔

دونوں سلطانوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ٹھیک ہے راہی تصویریں بناتا ہے اور

میں لکھتا ہوں لیکن ہم کرتے کیا ہیں۔ سلطان ولی چورت کے اوپر ایک چھوٹی سی

آبادی ٹانگے کا باشندہ تھا۔ وہاں پھاڑی پر اس کا گھر تھا، تھوڑی سی زمین تھی اور مال

موٹی تھے۔ گرمیوں میں جب اُدھر ٹیم آتی تھی تو وہ ان کے ساتھ پورے طور پر

منسلک ہو جاتا تھا۔ سلطان محمود باہر جا چکا تھا۔ باہر سے مراد ہے استور اور گلگت سے

باہر اسلام آباد اور پنجاب۔۔۔ وہ بھی کھیتی باڑی کا کام کرتا تھا اور گرمیوں میں سیاحوں کا

بوہہ اٹھاتا تھا۔

”جب تم لوگ کسی ٹیم کے ساتھ چلے جاتے ہو تو تمہارے مال ڈنگر اور کھیتوں

کی نگہداشت کون کرتا ہے۔۔۔؟
 "کرتا ہے ناں۔۔۔" سلطان دلی زمین پر لکیریں کھینچتا ہوا کہنے لگا اور یہ اس کی عادت تھی کہ جب کبھی وہ بات کرتا زمین پر کسی چھریا نشی سے لکیریں کھینچنے لگتا اور اپنی گفتگو کے دوران "ہاں ناں۔۔۔" بہت استعمال کرتا۔
 "کون کرتا ہے ناں؟"

"ہمارا بھائی کرتا ہے۔۔۔ وہ ٹیم کے ساتھ جاتا ہے تو ہم کرتا ہے۔۔۔"
 بھائی سے اس کی مراد کرن حضرات کے علاوہ آبادی کے تمام مرد تھے۔ سلطان دلی کے بادشاہ چہرے پر ایک دل پر اثر کرنے والی بے حد سادہ معصومیت تھی۔ وہ بہت دن ہمارے ساتھ رہا اور اس دوران کسی ایک لمحے میں نے اس کے چہرے کو سادگی اور معصومیت سے الگ نہ دیکھا۔ اور اس میں لالچ نام کو نہ تھا اور اس کی مسکراہٹ بچوں کی طرح پرکشش تھی۔ عام طور پر پورٹر آپ کا کھانا نہیں پکاتا لیکن سلطان نے یہ ذمہ داری اپنی مرضی سے قبول کر لی اور اب بید سگھڑ پیو کی طرح پہلے ہمیں کھانا کھلاتا تھا اور پھر بچا کچا خود کھا کر برتن وغیرہ صاف کر کے کسی چھریا بیٹھ کر ہماری طرف دیکھتا رہتا تھا۔

"یہ جو تمہارا بیٹا ہے، میرے۔۔۔ یہ بہت اچھا ہے" سلطان خوشی کے ساتھ کہہ رہا تھا "یہ اس نے آٹھ جماعت پاس کر لیا ہے؟"
 "ہاں۔۔۔"

"تو پھر اس کا شادی بٹاؤ بڑا ہو گیا ہے۔۔۔" اس نے ماتھے پر تھوڑی ڈال کر بڑے مدبرانہ انداز میں مجھے مشورہ دیا اور پھر کچھ سوچ کر دیر تک سر ہلاتا رہا۔
 "اور لوگ آتے ہیں۔۔۔ جنگل اور پہاڑ ہے۔۔۔ آبادی نہیں۔۔۔ تو اگر کوئی بیمار ہو جائے ٹیم کا مہر تو اس کا علاج کیسے ہوتا ہے؟"

"ٹیم کے ساتھ 'ڈاکٹر بھی آتا ہے۔۔۔ لیکن جو چھوٹا ٹیم ہوتا ہے تمہارے جیسا اس کا تو اللہ تمکبان ہوتا ہے۔۔۔ محمود۔۔۔" وہ اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا "یاد ہے میں اس انگریز کو کیسے لے گیا تھا؟"

"ہاں۔۔۔" محمود نے سر ہلایا "صاحب یہ ایک انگریز کے ساتھ اور آیا 'ٹاپ میدان میں اور انگریز بیمار ہو گیا۔۔۔ بے ہوش ہو گیا بالکل۔۔۔ پھر یہ تڑشک واپس گیا رات کو کیونکہ ہم لوگ رات کو بھی آسانی سے سفر کرتے ہیں اور وہاں سے گھوڑا لایا

اور پھر گھوڑے پر بٹھا کر استور تک لے گیا۔۔۔ تب استور تک جیب نہیں جاتی تھی۔۔۔"

"صاحب اور ان دنوں دیشنگ میں جو جاپانی ٹیم کا کیپ ہے تو اس میں ایک لیڈی بہت بیمار ہے۔ پہاڑ سے گرا ہے ٹانگ ٹوٹ گیا ہے۔۔۔"
 "تمہیں کیسے پتہ ہے؟" میر نے پوچھا۔

"راستے میں جو لوگ ملتے ہیں وہ بتاتے ہیں۔ ان پہاڑوں میں ٹانگا پر بہت کے دامن میں اگر کچھ ہو جائے تو سب کو پتہ چل جاتا ہے۔۔۔ اس وقت سب کو پتہ ہے تڑشک میں روپل میں اور اور مازو پاس تک کہ سلطان دلی اور محمود ایک تین مہر ٹیم کے ساتھ میں کیپ جا رہا ہے۔"
 "اور پاکستانی ٹیم بھی آتا ہے؟"

"ناں۔۔۔ کم آتا ہے۔۔۔ یہ جو تمہارا بیٹا میر ہے تو اس سے چھوٹا پاکستانی اور کبھی نہیں آیا۔۔۔ یہ بہت ہمت والا ہے۔۔۔"

میر نے ذرا گردن اٹھا کر سب کی جانب دیکھا۔۔۔ الاؤ تاریکی سے بلند ہو کر اس سفیدی کے آگے ایک پتے ہوئے سرخ پردے کی مانند لہراتا تھا جو ٹانگا پر بہت کا وجود تھا۔۔۔ ہم سب اس کے آتشیں بھاؤ کو نکتے جاتے تھے جس کی زبانیں تاریکی کو چاتی تھیں۔۔۔ ہمارے پیچھے سردی کے سرد ہاتھ تھے اور ہم سڑکتے ہتھیلیاں پھیلاتے آگ کے قریب ہوتے جاتے تھے۔۔۔

"اور جانور بھی آتا ہے؟"

"ہاں ناں۔۔۔ مارخور ہوتا ہے اور اور ٹاپ میدان میں ہرن تو میں نے دیکھا ہے۔۔۔ اور شیر بھی ہوتا ہے۔"

شیر کا نام سن کر رانی ذرا چوکنہ ہوا "یہ شیر کیسا ہوتا ہے؟"

"بھیرے کی طرح ہوتا ہے۔۔۔" سلطان محمود نے کہا۔

"شیر، بھیرے کی طرح کیسے ہو گا۔۔۔ مائی فریڈم نے کچھ اور دیکھا ہو گا۔"

"بھیرے کی طرح شکل نہیں صاحب۔ اس کا بال اور رنگ بھیرے کے

موافق ہوتا ہے۔۔۔ ہم نے دیکھا ہے۔" سلطان یقیناً سنو لیوڈ کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

رانی نے میری جانب دیکھا اور پھر خوفزدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا

”اس کا مطلب ہے کہ ادھر بھیڑیا تو ضرور ہوتا ہے۔“

”راہی چاہا۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ”میرے پاس ساتھی آلو کی کھسی ہوئی ایک پاکستان گھینڈ ہے جس میں وہ لگتا ہے کہ روپل ٹانگا پریت کے جنوبی رخ پر واقع ہے اور یہاں بے شمار بھیڑیے گھومتے ہیں جو بکریوں اور بھیڑوں کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ اسی لیے یہاں کا ماحول انتہائی ڈراؤنا ہے اور لگتا ہے کہ ہم کسی اور دنیا میں آگئے ہیں۔“

”ہمیں تو ڈر لگ رہا ہے بابا۔“ راہی جان بوجھ کر کپکپانے لگا ”باپ رے باپ۔“ تو ادھر تو ہم بالکل اکیلا رات کیسے گزارے گا۔“

”اُنی لے تو آگ جلا یا ہے صاحب۔۔۔ بھیڑیا پاس نہیں آئے گا۔“ سلطان سوچی لکڑیاں اپنے گھسنے پر رکھ کر توڑتا اور انہیں الاؤ میں جمونک دیتا۔۔۔ ”ادھر ایک سال بہت بڑا آگ جلا تھا صاحب۔۔۔ وہ آگ بہت دور سے دکھائی دیتا تھا۔ روپل سے ٹاپ میدان سے۔۔۔“

”کس نے جلا یا تھا؟“

”جاپانی لوگ تھا صاحب انہوں نے جلا یا تھا۔ ادھر ایک ٹیم آیا تھا تو اس کا ایک نوجوان ڈاکٹر ٹانگا پریت کے کیمپ ٹو سے گر گیا۔۔۔ کیمپ ٹو میں بھی گیا ہوں۔۔۔ تو پھر وہ مر گیا۔ ادھر برف سے جم گیا۔ ٹیم نے جاپان تار بھیجا کہ ڈاکٹر مر گیا ہے تو ہم اس کا لاش بھیجے یا ادھر کچھ کر دے کیا کرے۔۔۔ ادھر سے اس کا ماں باپ اور بہن نے کھسا کہ ہم آتا ہے۔ وہ آئے اور استور سے تیل کا ٹین خرید لیا۔ پھر ادھر آیا۔۔۔ ٹیم کے لوگ نے اس کا لاش برف میں رکھا تھا۔ اسے نکال کر نیچے ٹاپ میدان میں لائے۔۔۔ لکڑیاں جمع کر کے اس میں اسے رکھا پھر تیل ڈال کر آگ لگا دی۔“

”وہ تو بہت روتے ہوں گے سلطان؟ اس کے ماں باپ؟“ میر کچھ دیر کے بعد

بولی۔

”ہاں ناں۔۔۔ روتے ہوں گے پر ہمیں کیا پتہ صاحب۔۔۔ جب انہوں نے تیل ڈالا تو آگ لگنے سے پہلے ہم کو کہا کہ تم اب جاؤ۔ ہم تمہارے سامنے اپنے بیٹے کو آگ نہیں لگائے گا۔ صرف اس کام کے لئے آئے تھے۔“

ہم پانچ تھے جو اس رات ٹانگا پریت کے روپڑ الاؤ کے گرد بیٹھے تھے اور آگ کو دیکھتے تھے اور ہم تین سوچتے تھے کہ ان جاپانیوں نے پورٹرز کو کیوں کہا تھا کہ ہم

تمہارے سامنے اپنے پیارے کو نذر آتش نہیں کریں گے۔ تم چلے جاؤ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ شائد ماں نے اپنے بیٹے کے منہ چرے پر انگٹے ہوئے بالوں کو سنوارا ہو۔۔۔ شائد باپ نے اس کے سر ماتھے پر بوسہ دیا ہو اور شاید بہن اس سے لپٹ کر آخری مرتبہ چٹی ہو۔۔۔ شائد!

ساری رات غصے کا ایک حصہ تیز ہوا سے پھڑپھڑاتا رہا۔ یہ ہوا تھی یا کچھ اور تھا ہم اندازہ نہ لگا سکے۔ بہت دیر کچھ نہ ہوتا ”سوئے دریا کے شور اور ہوا کی سرسراہٹ کے اور پھر یکدم کچھ پھڑپھڑانے لگتا۔ اور ہم خوفزدہ ہو جاتے۔

رات ہماری توقعات کے برعکس زیادہ سرد نہ تھی۔۔۔ یہ شوکر کی کیمپنگ سائٹ کا کمال تھا کہ یہاں ہوا سے بچاؤ ہو جاتا تھا۔

رات کے وقت شدید سردی کی وجہ سے کھیشیر بھی آرام سے پڑا رہتا ہے اور اس کے تودے الگ ہو کر دریا میں نہیں گرتے۔

محمود رات بسر کرنے کے لئے ٹاپ میدان میں چلا گیا تھا جہاں اس کے خاندان کی بنگ تھی۔۔۔ وہ اپنے مال ڈنگر سمیت وہاں مقیم تھے۔ اور سلطان آگ کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے الاؤ اس طریقے سے روشن کیا تھا کہ اس کے شعلے پتھروں کو گرم کرتے رہیں اور یوں وہ ان پتھروں کے ساتھ لگ کر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

فیلڈ چوٹی سے نزدیک اور سرکل گلی ... اور ٹانگا پریت کا جنوبی شانہ ... چوٹی سے ذرا نیچے شانے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

یہ ایک شاندار منظروں والی روشن ترین صبح تھی۔ اور اسے صرف وہ دیکھتے ہیں جو روشن نصیب ہوتے ہیں۔

میر خیمے سے باہر آیا اور ٹیلے پر بیٹھ کر دانتوں کو برش کرنے لگا۔ میں نے تصویر اتاری۔ پٹھانی ٹوپی اور جیکٹ میں ٹھنڈک سے محفوظ ایک ہاتھ میں ٹوتھ پیسٹ کی ٹوب اور دوسرے میں برش اور پس منظر میں نیلا آسمان اور ٹانگا پریت جیسے اس کے کندھے کے اوپر سے جھانکتی ہوئی۔

سوکھا دودھ ہمارے بست کام آ رہا تھا اور سلطان نے ناشتے کے لئے گرم ایلے ہوئے دودھ میں کارن فلیکس اور چینی ڈال کر ہر کسی کو سروس وہاں دی جہاں کہ وہ تھا۔ راہی ہم سے کچھ دور ایک بست بڑے پتھر پر بیٹھا تھا اور کچھ کیچ کر رہا تھا۔ میر برش کر رہا تھا اور میں اپنا پیالہ تمام کر دو چار احتیاط پسند قدم اٹھا کر چھوٹے ٹیلے پر جا بیٹھا جہاں سے "منظر" دکھائی دیتا تھا۔ "منظر" ہمیشہ سے میری کمزوری رہا ہے۔ ہوٹل کی کھڑکی سے کیا نظر آتا ہے۔ ٹرین کی کھڑکی۔ جہاز کی ونڈو سیٹ۔ میں اب بھی منظر دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ پھر یہ کہ میرے خیمے کا دروازہ منظر پر کھلنا چاہئے۔ اور اگر میرے پاس کافی کا ایک پیالہ ہے۔ کھانے کو کچھ ہے تو میں تردد کر کے کسی ایسی جگہ جا بیٹھوں گا جہاں "منظر" ہو۔ چاہے اس جگہ بیٹھ کر خوف سے گھمکی بندھ جائے اور کافی کا پیالہ ہاتھ سے چھوٹ کر کھائی میں جا گرے۔ لیکن "منظر"۔ تو یہ وہی پچھلی شب والا ٹیلا تھا جہاں سانس روک کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ لیکن آج منظر چمکیلا اور صاف تھا۔ اور میں ذرا دلیر ہو کر گردن آگے نکال کر نیچے جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ظاہر ہے یہاں سے معاملات وحرام سے نیچے جا رہے تھے۔ چند جھانکیاں تھیں اور پھر گلیشیر میں سے جنم لیتا ہوا دریائے روہل تھا۔ ٹیلے سے پورا روہل گلیشیر نظر آ رہا تھا اور یہ تقریباً ایک کلومیٹر کا علاقہ گھیرے ہوئے تھا۔ اس پر پتھر اور سنگریزوں کے ڈھروں کے علاوہ بے شمار دراڑیں تھیں اور دو چھوٹی چھوٹی جھیلیں بھی تھیں۔ اس گلیشیر سے پرے ظاہر ہے ٹانگا پریت تھی اور چوٹی کے عین نیچے سڑنگ کا میں یکپ تھا جہاں ہم نہیں جا سکے تھے۔

"صاحب ... سلطان کی آواز آئی اور میں نے پیچھے دیکھے بغیر پوچھا کہ کیا ہے؟

"کافی صاحب۔"

"ٹاپ میدان اور شل مکھ دیا میر"

جیسے شوکور میں رات ہوئی تو یکدم ہوئی ایسے وہاں صبح ہوئی تو یکدم ہوئی۔ ہمارا زرد خیمہ روشنی سے بھرا ہوا تھا اور اس کی زردی سے ہمارے چہرے زرد ہوتے تھے۔ میر سویا ہوا تھا اور راہی باہر جا چکا تھا۔

باہر سلطان گدھوں کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ ہو ہو۔ میں نے پوچھا کیا بات کرتے ہو تو کہنے لگا گدھوں کے ساتھ بات نہ کرو تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ میں پوچھ رہا تھا کہ رات کیسی گزری۔

"ویسے تمہاری رات کیسے گزری؟" میں نے پوچھا۔

"نیند نہیں آئی صاحب۔ سردی بست تھا میں نے صبح صبح آگ جلا لیا تھا بالکل مجبور ہو کر تو چاچا آنکھ ملتا باہر آگیا تھا کہ کیا ہوا ہے۔" سلطان راہی کو جانے کیوں چاچا کہتا تھا اور جب کبھی راہی کسی سخت مقام پر کھڑا ہو کر پھیند پونچھتا یا سستانے کے لیے بیٹھ جاتا تو سلطان کہتا چاچا ڈاکن ہو گیا ہے۔

اور چاچا راہی ٹانگا پریت کی جانب چہرہ کئے چپ کھڑا تھا اور میں نکل نہ ہوا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ بھی محو گفتگو ہے۔

شوکور کی اس صبح میں ساڑھے پانچ بجے ہر شے روشن تھی بلکہ تیز روشنی میں تھی۔ آسمان پر سوائے گہری نیلاہٹ کے کوئی ایک وجہ بھی نہ تھا، کوئی پرندہ کوئی بادل کوئی کچھ نہ تھا اور اس ٹیلے اور خالی سمندر میں ٹانگا پریت کی سب سے اونچی چوٹی ایک سفید بادبانی کشتی کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اپنے پورے سفر میں ٹانگا پریت کی بہترین تصویریں شوکور میں اس روشن صبح میں اتاریں۔ مجھے اس برف کے قلعے کا ایک ایک حصہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں وی لینڈ آئس فیلڈ ہے۔ ایک کمپ ٹو سے پہلے۔ ویلین باخ آئس فیلڈ ہے یکپ فور کے پاس۔ پھر مرکل آئس

”مارڈ صاحب میرے پاس الرجی کی دوا ہے بہت اچھی، آپ کو چاہئے؟“
 ”نہیں۔۔۔ اور میرے پاس بہت ساری دوائیں ہیں آپ کو چاہئے؟“
 ”جب چاہا ڈاؤن ہو گا پھر چاہئے ابھی نہیں۔۔۔“ رائی ہنسنے لگا۔

سلطان، محمود دونوں گدھے اور سیر آگے آگے۔۔۔ پھر سلطان اور انڈوں کی پوٹلی۔۔۔ اس کے پیچھے رائی اور سب سے پیچھے ٹیپو سلطان۔۔۔ اس لیے کہ میں ہمہ وقت قبضی شلوار کے ساتھ کپڑے کا ایک بڑا سیٹ ہنسنے رکھتا تھا۔۔۔ روپل کے راستے میں جب میں ایک پہاڑی سے نیچے اتر رہا تھا تو رائی نے دور سے مجھے دیکھا اور پھر کہنے لگا ”آپ جب ادھر سے نیچے آ رہے تھے تو آپ کا لباس ہوا میں اڑتا تھا اور سیٹ کا زاویہ ایسے تھا جیسے ٹیپو سلطان کی پگڑی کا ہوتا تھا۔۔۔ تو لگتا تھا کہ بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں۔۔۔“ رائی نے یہ بات ہونٹ بھیج کر اتنی سنجیدگی سے کہی تھی کہ میں یہ نہ جان سکا کہ یہ بنگالی باوجود ادا کر رہا ہے یا واقعی سنجیدہ ہے۔ لیکن جب میں نے رائی کو اچھی طرح جانا تو یہ جانا کہ وہ بڑی مصومیت سے آپ کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ کر آپ کو چاروں شانے چت کر دیتا ہے اور پھر بڑے بھولپن سے چاروں طرف دیکھتا ہے کہ اسے کس نے گرایا ہے۔۔۔

ہماری کمپننگ سائٹ کے قریب ہی وہ گھیشیر تھا جس کا ذکر میرے کیا تھا۔۔۔ یہ ایک عام اور بیہودہ سا گھیشیر تھا جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا سوائے اس کے کہ یہ ایک گھیشیر تھا اور جس پر رائی نے حسب روایت ایک جاپانی سمورائے یا خوفناک قاتل کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر خلاؤں میں گھومتے ہوئے تصویر اتروائی۔۔۔

گھیشیر کے بعد پتھروں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جس میں ذرا احتیاط سے چلنا پڑتا تھا۔ دائیں طرف روپل گھیشیر کے سیاہ ہاتھی سر جوڑے زور لگا رہے تھے اور دھوپ کی وجہ سے برف پگھل رہی تھی اور بڑے بڑے ٹکڑے گونج کے ساتھ نیچے گرتے جا رہے تھے۔۔۔ آسمان میں نپلاہٹ کی بجائے غیر واضح دھند نما بادل بھیل رہے تھے۔۔۔ نانگا پربت کے مختلف حصوں پر الگ الگ بادل دھوپ کی طرح اٹھنے لگے تھے۔۔۔ پتھروں کے سلسلے کے بعد ایک راستہ سامنے آیا جو جھاڑیوں اور درختوں میں سے گذر کر پہاڑ کے ساتھ اونچا ہو رہا تھا اور مختصر ہو رہا تھا۔۔۔ اتنا مختصر کہ اس پر چلنے کا سوچ کر ہمارے ماتھے پسینے سے بھیکے۔ جہاں سے راستہ اونچا ہوتا تھا وہاں محمود اور گدھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ”صاحب میں آگے جاتا ہوں“ ٹاپ میدان میں

میں نے ہاتھ پیچھے کیا اور مک کی گری کو ہتھیلی میں محسوس کرتے ہوئے اس پر انگلیاں پھیلت دیں۔۔۔ محمود آچکا تھا اور وہ نیچے کی بیٹھیں زمین میں سے نکال رہا تھا۔۔۔ اور ہاں رات کی خوفناک پھڑپھڑاہٹ کے بارے میں کھلا کہ دراصل ایک میخ ڈھیلی ہو کر نکل گئی تھی اور نیچے کا اتنا حصہ کھل کر ہوا میں پھڑپھڑانے لگا تھا۔۔۔
 کافی ختم کر کے میں اپنی آماجگاہ سے نیچے آگیا۔۔۔ رائی میرے پاس آیا ”ٹھیک ہے مارڈ صاحب“ اس نے فنی انداز میں مجھے سیلوٹ کیا۔
 ”کس بات کا چاہا؟“

”یہ۔۔۔ نانگا پربت دکھانے کا۔۔۔“
 ”چاہا ڈاؤن ہو گیا ہے“ میں نے سلطان کی طرف دیکھ کر کہا اور سلطان بے حد راضی ہوا اور ہنسنے لگا۔
 محمود گدھے پر سامان لا رہا تھا ”صاحب آج تو ستر کم ہے۔۔۔ دو تین گھنٹے میں پہنچ جائے گا۔۔۔ آپ ادھر ہماری بک میں ٹھہرو کھانا بھی مل جائے گا۔“
 یہ عجیب بات تھی کہ پنجاب کے دیہات میں مال موٹی کے ساتھ کھیتوں میں جو بیٹھک ہوتی ہے اسے بک کہتے ہیں اور یہاں نانگا پربت کے دامن میں بھی یہی لفظ استعمال ہوتا تھا۔

”رائی چاہا رات نیند تو ٹھیک سے آئی؟“
 ”ہاں۔۔۔ نیچے میں سونے کا پہلا ٹائم تھا میرا۔۔۔ لیکن میں سوتا رہا۔۔۔ صرف یہ ہوا کہ رات کسی وقت میرا پاؤں کسی رسی میں الجھ گیا۔ میں نے آرام سے چھڑانے کی کوشش کی تو وہ ذرا زیادہ پھنس گیا تو میں نے سوچا شاید کسی شے نے پکڑ لیا ہے تو ذرا پراہم ہو گیا۔“

سلطان پھر راضی ہو کر ہنسنے لگا ”رات چاہا ڈاؤن ہو گیا۔“
 ہم روانہ ہونے لگے تو میں نے سلطان سے انڈوں کی پوٹلی کے بارے میں پوچھا۔۔۔ وہ کچھ شرمندہ سا ہوا اور پھر ٹوپی اتار کر بالوں میں گھبلی کر کے کہنے لگا ”صاحب ایک ٹوٹ گیا۔“

”اور باقی رہ گئے چار۔۔۔“ میرے کہا۔
 ”انشاء اللہ اب بالکل نہیں ٹوٹے گا“ سلطان نے اپنے سینے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا اور اب یہ اس کی عزت کا سوال تھا۔ اس نے پوٹلی کو ایک شاہی عصا کی طرح اٹھایا اور اسے نظروں کے سامنے رکھ کر چلنے لگا۔

گدھوں کے ساتھ۔ آپ آرام کے ساتھ آؤ۔ میں وہاں پہنچ کر آپ کے لئے چائے پکواؤں گا۔ ٹھیک ہے صاحب؟

میرے سر ہلانے پر وہ گدھوں کو ہانکتا اس تک پگڈنڈی پر چڑھنے لگا اور مجھے ان گدھوں کو ذرا ڈولتے ہوئے چلتے دیکھ کر خدشہ ہوا کہ یہ گریں گے۔ اور مجھے گدھوں سے زیادہ اپنے سلمان کی فکر تھی۔ ہماری رہائش اور خوراک اور لباس اسی سلمان میں تھے۔ اور اگر گدھا سلمان سمیت نیچے روپل گیشیر پر گرتا ہے تو پھر وہاں سے سلمان واپس لانا ممکن نہ تھا۔ جب محمود اور گدھے بحفاظت وہاں سے گذر گئے اور ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو ہم بھی اس تک پگڈنڈی پر چڑھنے لگے۔ یہ راستہ نہ صرف تنگ تھا بلکہ ہموار ہونے کی بجائے اس میں گیشیر کی جانب جھکاؤ تھا۔ چنانچہ قدم اٹھاتے ہوئے بدن کا جھکاؤ خواہ مخواہ گیشیر کی جانب ہوتا۔ راستہ اونچا ہوا اور پھریوں دکھائی دیا جیسے اس کے آگے کچھ نہیں ہے۔ اس مقام پر پہنچے تو راستہ نیچے اترتا تھا لیکن چند میٹر کی ڈھلان کے بعد اترتا تھا۔ اس ڈھلان پر سے ہم کھڑے ہو کر نہیں بلکہ سلطان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ کر موٹی بٹنوں کی طرح اپنے آپ کو آگے کھینچتے ہوئے اترے۔ اس خطرناک حالت میں بھی ڈھلان میں سے نکلنے ہوئے گلابی پھولوں کے جگے خوبصورت لگ رہے تھے۔ تھوڑی دیر رکنے کے بعد ہم اس جگہ کے عین اوپر کھڑے تھے جہاں سے روپل گیشیر کا آغاز ہوتا تھا اور ایک تیز نالہ گیشیر کے اندر جا رہا تھا۔ چنانچہ شوکر کے نیچے جو نالہ گیشیر میں سے نکلتا تھا وہ یہی تھا اور اس کا منبع روپل گیشیر میں تھا۔ اب آسمان بڑا ہونے لگا اور ہم جس پہاڑ سے چٹنے چلتے تھے اس کی بلندی پرے ہوتی گئی اور کم ہوتی گئی۔

ہم نے یہیں سے ٹاپ میدان کی پہلی جھلک دیکھی۔

ہم پہاڑ سے الگ ہو کر ایک پتھری سرزمین پر چلے گئے جس میں کہیں کہیں نالے عمود کرنے پڑتے تھے۔ روپل گیشیر کے اندر جانے والا نالہ ہم سے دور ہو گیا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد ہم ٹاپ میدان کے قریب پہنچ گئے اور ہم اس کے کنارے پر تھے۔

اور ہم شاید ۱۹۸۹ء میں وہاں نہیں تھے۔ ہم کسی اور زمانے کے مسافر تھے جو کسی کارواں کے ہمراہ یہاں پہنچے تھے۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ جگہ موجود ہے۔ یہ ہماری منزل نہ تھی۔ بلکہ اسے دیکھتے ہوئے ہمیں یقین تھا کہ ہم دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے کیونکہ ایسی جگہیں صرف ایک بار دکھائی دیتی ہیں اور پھر کہیں اور منتقل ہو

جاتی ہیں۔

ٹاپ میدان وسط ایشیا کی ایک وسیع چراگاہ کی طرح تھا۔ اس کے وسیع سبزہ زار میں ایک دریا بہتا تھا اور زمین کے ساتھ لگ کر بہتا تھا اور اس میں چھوٹے نالے اور نالیاں شامل ہوتے تھے۔ زمین پانی کی بہتات کی وجہ سے اسٹخ کی طرح نرم تھی اور اس میں لمبی لمبی گھاس اگ رہی تھی۔ دریا کے پار پورے ٹاپ میدان پر سایہ فگن ٹانگا پریت کا سفید شہر تھا۔ اس کی چٹانیں اس کی برقیں اور اس کی بلندیاں تھیں اور ان پر دھند تھی۔ گھاس کے وسیع قطعات میں مویشی چر رہے تھے۔ اس ڈھلان پر جس پر ہم چل رہے تھے بلندی کی جانب چڑھانوں کے جمونپڑے اور مویشی خانے تھے اور ان کے بچے شور مچاتے بھاگتے چلے جاتے تھے۔ اور ہمیں حیرت سے دیکھتے تھے۔ ہم واقعی کسی اور زمانے کے مسافر تھے کیونکہ یہ عظیم منظر قدامت میں رہا ہوا تھا۔ ایک ایسی چراگاہ جو دنیا کے بلند ترین پہاڑوں میں سے ایک کے دامن میں پوشیدہ ہے۔ جہاں ایک ایسی وسعت ہے جس کے اندر داخل ہو کر انسان جھکنے لگتا ہے۔ قدرے خوفزدہ ہو جاتا ہے اور اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔ مار کو پولو یا ابن بطوطہ ایسے ہی مناظر میں داخل ہوتے ہوں گے۔ اور ٹاپ میدان کا یہ منظر ہزاروں برسوں سے ایسے ہی تھا۔ یہاں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو وقت اور عہد کی غمازی کرتی۔ چڑھانوں کے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کردہ لکڑی کے مکان۔ عورتوں اور بچوں کے لباس۔ ان کے چروں کی حیرت۔ دریا اور نالے اور ٹانگا پریت کی چوٹیاں جن پر دھند اتر رہی تھی۔ صرف ہم تھے جو اس عظیم چراگاہ میں وقت اور عہد لے کر داخل ہو رہے تھے۔ ہمارے رک سیک 'لباس اور شہری چہرے۔

"رک جاؤ بابا رک جاؤ۔" راہی سر اٹھائے کبھی ٹانگا پریت کی برفوں کو دیکھتا تھا اور کبھی اس وسیع میدان کو جس کے کنارے پر ہم چل رہے تھے۔

ڈھلان کے اوپر چڑھانوں کے جو پانچ سات جمونپڑے تھے ان کے باہر محمود کھڑا ہمیں ہاتھ ہلا رہا تھا۔ ہم گیشیر کے پانیوں کو پھلانگتے اس کی جانب چلے گئے۔ اور وہ نیچے آنے لگا۔ اس کے پیچھے چھوٹے چھوٹے بچوں کا ایک غول تھا جو "میٹی میٹی" کا شور مچاتا تھا۔ ادھر جو کوہ یا نہیں آتی ہیں وہ عام طور پر مقامی بچوں میں خیر سنگالی کے طور پر سوشل تقسیم کرتے ہیں اور یہ بچے ہمیں بھی غیر ملکی سمجھ رہے تھے۔ اور یہ حقیقت تھی کہ ہم باہر سے آئے تھے۔ ہم واقعی کسی اور ملک کے تھے۔

محمود نے سرسبز دھلون پر پاک کی اون سے بنا ہوا ایک غالیچہ بچھا رکھا تھا۔ اس پر چائے تھی۔ اور چائے دانی میں سے بھاپ نکلتی تھی اور ایک گندے دسترخوان میں لپٹے پرائے ابھی گرم تھے۔

ہم غالیچے پر بیٹھ گئے۔ گھاس کی سردی پاک کی اون میں سے سڑکتی تھی۔ اور اس چراگاہ میں چائے کا ذائقہ کچھ اور تھا اور کیس اور سے آیا تھا اور پرائے کے ساتھ گرم چائے کا ایک گھونٹ ٹانگا پریت کی سرد ہواؤں کے سامنے بھی بس کچھ اور تھا اور پتہ نہیں کہاں سے آیا تھا۔

ٹاپ میدان کے درمیان میں جو دریا بہتا ہے وہ مہلنت اور ملاز سے آتا ہے اور اس کا نام ”کمپ ٹی سن“ ہے لیکن باہر کے لوگ اسے دریائے روہل کہتے ہیں۔ ٹاپ میدان کے دائیں جانب ترشک کشیر کی مانند ایک اونچا کنارہ ہے اور اس کے برابر میں جو پہاڑی ہے وہ میل کھلاتی ہے۔ یہاں جو چڑنما درخت ہیں اور جنہیں جلا کر مقامی چرواہے سردیوں کے لیے کوئلہ بناتے ہیں ان کا نام ”چلی“ ہے۔ کسی زمانے میں گریبال موس ٹاپی ایک جانور اس میدان میں پایا جاتا تھا جو عقاب کی مانند تھا۔

اور یہ چوٹی ٹانگا پریت صرف ہمارے لیے ہے۔ مقامی آبادی اسے ”شل کھی دیا میر“ کہتی ہے۔ شل کھی سو چروں والا پہاڑ۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کا ایک چرو چلاس سے دکھائی دیتا ہے، دو سرا جنگوٹ سے۔ تیرا ترشک سے۔ اور۔۔۔ اس طرح اس کے سو چرے ہیں۔ یہ پہاڑ مقامی لوگوں کے لیے ایک بڑے بوڑھے کی طرح ہے۔ ایک مہیاں بزرگ ہے جس کے دامن میں وسیع چراگاہیں ہیں جہاں کبھی پانی کی کمی نہیں ہوتی۔ اس کے خنڈے لاتعداد ہیں اور اس کی ہوا میں تندرستی ہے۔ شادی کے موقع پر ماں اپنی دولہن بیٹی کی تعریف کرتی ہے تو اسے ”میری دیا میر مہیس“ کہتی ہے یعنی میری ٹانگا پریت کی طرح اونچی اور لمبی بیٹی۔

سامنے ٹانگا پریت کے پہلو میں ایک سرسبز پہاڑ ہے جس کا نام ”کھل“ ہے جس کے معنی دھلون کھلیان کے ہیں۔ وہاں کاشت کے لیے لوگ جاتے ہیں اور وہیں کھل کے علاقے میں ”سسر“ بوٹی بہتات میں پائی جاتی ہے۔ اسے خوشبو کے لیے جیب میں رکھتے ہیں اور اگر کپڑوں میں رکھی جائے تو انہیں کیزا نہیں لگتا۔۔۔ مقامی لوگوں کی اکثریت اپنی چھوٹی موٹی تیاریوں کے لیے جڑی بوٹیاں استعمال کرتی ہے۔

تو ہم اسی ٹاپ میدان میں پاک کے بالوں کے ایک غالیچے پر بیٹھے تھے۔ اپنے سامنے کے اس منظر پر نظر رکھتے تھے جو ہمارے نصیب میں تھا اور خلق کو گرائش دیتی چائے ہمارے بدن میں اترتی تھی۔ پھر ایک گز گزابت ہوئی اور چند بھیڑیں خوفزدہ ہو کر منہ اٹھائے اور اوپر دیکھنے لگیں۔ اس مقام تک نظروں کو پہنچنے کے لیے کچھ وقت لگا، ٹانگا پریت کی چوٹی کے قریب سے برف کا ایک تودہ ایک طوفان کی صورت میں نیچے آ رہا تھا اور اس کا سفید سفوف دھند کی صورت میں اٹھ رہا تھا۔۔۔ میر پہلے تو ”کہاں ہے۔۔۔ کہاں ہے ابو“ کہتا ٹانگا پریت کے پورے سلسلے پر طائرانہ نظر ڈالتا تھا لیکن پھر اس کی نظریں بھی اس مقام تک جا پہنچیں۔۔۔ جو چٹانیں لہو بھر پہلے نکلی تھیں وہ برف سے ڈھکی جا رہی تھیں۔ یہ طوفان پل دو پل کے لیے تھا لیکن باریک برف بہت دیر تک باؤل کی صورت چوٹی کے قریب معلق رہی۔

صاحب آپ اوپر رات گزارو ہمارے جھونپڑے میں۔۔۔ آپ کو کمرہ دیں گے“ محمود کی آرزو ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔

”ہم کمرے سے بھاگ کر تو اوپر آیا ہے۔۔۔“ راہی مسکراتا ہوا کہنے لگا ”ہاں اگر بارش ہوا تو پھر ہم بھاگ کر آجائے گا تمہارے کمرے میں کیونکہ ہمارا ٹینٹ بہت باریک ہے۔۔۔ اچھا تو اوپر اصلی میں کیپ کونسا ہے ٹانگا پریت کا؟“ سلطان ولی حسب عادت زمین پر گھیریں کھینچنے لگا لیکن وہاں فی بہت تھی ”یہ اوپر سب جگہ کیپ لگتا ہے۔۔۔ جاپانی زیادہ تر اوپر سینگ میں جاتا ہے“ اس طرف۔۔۔ اگر کشیر سخت ہوا تو آپ کو اوپر بھی لے جائے گا۔ پھر یہ سامنے درختوں کے پیچھے چٹانوں کے بالکل نیچے شی گیری ہے یہاں پر جرمن بھی آکر کیپ کرتا ہے۔ اوپر لا تو ہو میں بھی میں کیپ ہے۔ اوپر جاپانی لوگوں کی قبریں بھی ہیں۔ تو یہ سب جگہ میں کیپ ہے۔“

ٹانگا پریت کے روہل چرے یا جنوبی چرے کی اصل وجہ شہرت چوٹی سے لے کر نیچے میں کیپ تک کا وہ چٹانی چروہ ہے جو ساڑھے چار ہزار میٹر بلند ہے۔ دنیا میں کسی جگہ کسی بھی پہاڑی سلسلے میں کوئی ایسا مقام نہیں جہاں آپ کھڑے ہوں اور آپ کے سامنے ایک چٹان ساڑھے چار ہزار میٹر تک کی اونچائی کی ہو۔ یہ ایک ناقابل یقین منظر ہے اور کئی سیاح صرف اس راک فیس یا دنیا کی بلند ترین چٹان کو دیکھنے آتے ہیں۔

ہم ٹاپ میدان میں دنیا کی صاف ترین ہوا کی تازگی میں سانس لے رہے تھے اور پاک کے منہ پر براہمن اس وسط ایشیائی طرز کی چراگاہ کی وسعت میں تھے اور فراموش کر چکے تھے کہ ہم نے ابھی وہاں سے کچھ دور لا تو بو جا کر کیمپ کرنا ہے۔ لیکن ہم نے یہ ارادہ بھی کر لیا کہ کم از کم ایک رات ہم ٹاپ میدان کی چراگاہ میں بھی بسر کریں گے۔

ہم بہت دل گرفتہ ہو کر نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ بیٹھے۔ یہ کیسی نشست تھی جو پاک کے منہ پر تھی، کیلی گھاس پر تھی لیکن میرے لیے تخت شای سے کہیں شاندار تھی۔۔۔ ہر روز سیاح کسی اور وقت کسی اور عہد میں داخل نہیں ہوتا۔۔۔

”لا تو بو بیس کیمپ نانگا پربت“

لا تو بو جانے کے لیے ہم نے ایک جھونپڑا ہوا شہتیروں کاہل عبور کیا جو کہ دریائے روہل پر تھا۔۔۔ اور یہاں یہ صرف ایک چھوٹے سے اگرچہ تیز و تند ہالے کی صورت میں بہتا تھا۔ یہی نالہ آگے جا کر ٹاپ میدان میں بچل جاتا ہے۔ یہاں چھلی یا مچھلی کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا جس کے اندر ایک راستہ جا رہا تھا۔ کچھ لوگ لکڑی سے کوئلہ بنانے کی خاطر درخت کاٹ رہے تھے۔ ایک روز میں نے ایک بہت بڑا والا دیکھا جو دھک رہا تھا اور چرواہوں کی کوشش تھی کہ یہ جلد از جلد ٹھنڈا ہو کر کوئلے میں تبدیل ہو جائے کیونکہ اس دوران اگر ہوا تیز ہو جائے تو لکڑی اتنی تیزی سے جلتی ہے کہ راکھ ہو جاتی ہے۔۔۔ میں نے سلطان سے کہا کہ یہاں لوگ درخت کاٹتے رہتے ہیں تو اس طرح یہ ذخیرہ ختم ہو جائے گا۔ کہنے لگا، ”میں یہاں درخت صرف کاٹتے نہیں بلکہ لگاتے بھی ہیں۔ یوں بھی چھلی بہت تیزی سے بڑھتا ہے۔“

ذخیرے میں سے گذر کر ہم نیچے اترے اور دائیں جانب نانگا پربت کے نیچے ایک بلند پہاڑی کے دامن میں ہم نے ”لا تو بو“ کو دیکھا۔۔۔ ”لا“ کا مطلب ہے نیچے یا نشیب اور ”تو بو“ کے معنی ہیں گھرا چٹانوں سے گھرا ہوا۔۔۔ لیبی گھریا ایک ایسا نشیب جو چٹانوں سے گھرا ہوا ہے۔ اور یہاں واقعی ٹاپ میدان کی وسعت اور تیز ہوا نہ تھی بلکہ ہم ذرا الگ ہو کر پردے میں آ گئے۔ اس پھیلاؤ کے بعد ہمیں یہاں خلی کا احساس ہوا۔۔۔ ہم لا تو بو کو دیکھ کر کچھ مایوس ہوئے۔ اور ہر وہ شخص ہو گا جو ٹاپ میدان میں سے گذر کر ادھر آئے گا۔

یہاں ایک بڑے پتھر کے قریب جسے ہم نے بابائی کا نام دیا اپنا سامان رکھا۔۔۔ دونوں سلطان خیمہ نصب کرنے لگے۔

خیمے کے حوالے سے ہمارا جغرافیہ کچھ یوں بنتا تھا کہ ہم جس پہاڑی کی اوٹ

میں تھے اس کا جنگل خیمے کے قریب تک آتا تھا۔ پہاڑی ٹانگا پریت کا ایک حصہ تھی اور یہاں سے ٹانگا پریت کا دیدار ذرا مشکل سے ہوتا تھا کیونکہ وہ عین ہمارے سروں پر معلقی تھی۔ پہاڑی پر مہمانت یا چھلی درختوں کا ذخیرہ تھا۔

خیمے کے سامنے "منظر" تھا۔

ذرا نیچے اتر کر "لا تو بو" کا وسیع میدان تھا جس کے نصف حصے میں گھاس تھی اور بقیہ حصے میں کنکر اور خشک مٹی۔ ان سے پرے ایک نامعلوم وسعت تھی جس کے اختتام پر برف پوش پہاڑوں کا ایک سلسلہ تھا۔ ان میں روپل پیک اور لالی پیکٹ نمایاں تھیں۔ یہ نام لالی پیکٹ کیا ہے؟ اس کے بارے میں میں لاعلم ہوں کیونکہ یہ معلومات میں نے سلطان سے حاصل کی تھیں اور جب بھی میں پوچھتا کہ سلطان اس چوٹی کا نام کیا ہے؟ وہ کہتا "لالی پیکٹ"۔ میں کہتا یہ تو کوئی نام نہیں۔ ایک مرتبہ پھر کہو تو وہ ایک مرتبہ پھر بڑے واضح الفاظ میں دہراتا "لالی پیکٹ"۔ اس سارے "منظر" میں جو اصل منظر تھا وہ لا تو بو کے میدان میں کسی دودھیا سانپ کی طرح مل کھاتی ایک ندی تھی۔ اس کی چوڑائی چار پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھی لیکن اس کے پانی ایسے شفاف تھے کہ انہیں دیکھنے کے لیے غور کرنا پڑتا تھا۔ یہ ندی میدان کے دائیں ہاتھ پر ٹانگا پریت کے عین نیچے واقع چند گھروں اور مویشیوں کے ایک باڑے پر مشتمل لا تو بو گاؤں کی ایک چٹان کے نیچے سے نکلتی تھی۔

اور یہ ایک قدرتی چشمہ تھا۔

اور اس ندی کا نام ملت ہے۔

لا تو بو کے نیچے بڑے پتھر "بابائی" پر براجمان ہمیں دیکھ رہے تھے۔

خیمہ نصب ہو گیا تو ہم نے اپنا سامان اس میں رکھا۔ اور پرسکون ہو گئے کہ یہ ہمارے سفر کی آخری حد تھی۔

سلطان کافی بنانے کے لیے ندی سے پانی لینے چلا گیا۔

میر بھی بے حد خوش تھا۔ کیونکہ اس نے اتنے دشوار سفر میں میرا ساتھ دے کر اپنی "مردانگی" ثابت کر دی تھی اور دوسری وجہ اس کے پاس تھی اور میں نے اس سے پتھر اس پر غور نہیں کیا تھا۔ گھر سے چلتے ہوئے لاہور میں ہمارے سامان کے ساتھ ایک چھوٹا سا پاکستانی پرچم بھی پیک کیا گیا تھا۔ اس پرچم پر "تارڑ" لکھا تھا اور اس کے نیچے میونہ - سلجوق - قرۃ العین - میر اور میرے دستخط تھے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم یہ پرچم ٹانگا پریت کے میں کیمپ میں لہرائیں گے چنانچہ میر نے وہ پرچم

ٹکالا اور کہنے لگا "ابو ہم میں کیمپ میں پہنچ گئے ہیں ہاں؟"

"بالکل۔۔۔"

"اور یہ جو آپ کے اوپر برف کا پہاڑ ہے یہ ٹانگا پریت ہے ہاں؟۔۔۔ تو پھر میں تارڑ خاندان کی جانب سے اپنے خیمے کے اوپر پاکستانی پرچم لہراتا ہوں۔۔۔" اس نے پرچم کو خیمے کے راڈ کے ساتھ باندھا اور پھر ہم دونوں نے مل کر "پاکستان زندہ باد" کا فلک شکاف نعرہ لگایا۔

"اور اب میں آپ کو ایک زبردست بات بتانے لگا ہوں۔۔۔" میر بے حد پر مسرت تھا "کیا آپ جانتے ہیں کہ میں ٹانگا پریت کے میں کیمپ تک پہنچنے والا سب سے کم عمر پاکستانی ہوں۔؟" وہ میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا اور اس کے پیچھے دنیا کی بلند ترین اور کوہ پیاکی کے حوالے سے دنیا کی مشکل ترین چوٹی کی لانڈوال برقیں تھیں جن پر دھند اترتی تھی۔

"کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو۔۔۔؟" مجھ میں بے یقینی تھی۔

"ہاں۔۔۔" اس نے زور زور سے سر ہلایا۔ "ہمارے دونوں سلطان یہ کہتے ہیں کہ مجھ سے چھوٹی عمر کا کوئی لڑکا آج تک ادھر نہیں آیا۔۔۔ صرف ایک آٹھ سالہ بچہ آیا تھا جس کی ماں جرمن تھی اور باپ پاکستانی لیکن وہ خود چل کر نہیں آیا تھا بلکہ پورٹر اسے اٹھا کر لایا تھا اور میں تو خود چل کر آیا ہوں ابو۔۔۔ پھر میں نے راستے میں بہت سارے لوگوں سے پوچھا۔۔۔ آپ کو یاد ہے 'ٹاپ میدان میں جو بوڑھے ملے تھے جو رسیاں بٹ رہے تھے اور میں ان سے بہت دیر باتیں کرتا رہا تھا۔ انہوں نے بھی یہی کہا ہے۔۔۔ وہ پچاس برس سے گرمیوں کے موسم میں ادھر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم سب سے چھوٹے پاکستانی ہو جو ادھر آئے ہو۔"

ہاں سلطان نے شوکور میں اس قسم کی بات کی تھی۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔۔۔ میر ٹانگا پریت کے روپل ساڑھ کے میں کیمپ تک پہنچنے والا سب سے کم عمر پاکستانی۔۔۔ عمر چودہ برس نویں جماعت کا طالب علم۔۔۔ لیکن یہ ہو بھی تو سکتا تھا۔

میرے سامنے میر کا مسرت سے دکھنا چہرہ تھا۔ خیمے کے راڈ پر پاکستانی پرچم اور پس منظر میں۔۔۔ ٹانگا پریت!

کرتے ہوئے ہمارے ساتھ ہو گا۔ تو ہم اپنے خیمے کے سامنے بیٹھے تھے۔ اور یار محمد آگیا۔ قیض شلوار، کوٹ ٹوپی، واڑھی اور بندوق سے لیس۔ اسے یقین تھا کہ نانگا پریت کے دامن میں کھل نائی ہو چراگاہ ہے اس کے اوپر سنو لیوڈ یا برفانی چیتا موجود ہے۔ اور تب اس نے اپنے تئیں ایک کارنامہ بیان کیا کہ کل میں نے لالتوبو کا آخری ہرن ہلاک کیا تھا۔

”یار محمد تم نے اسے کیوں مارا؟ اللہ کی مخلوق تھا اور چپ میدان میں چوکڑیاں بھرتا خوبصورت لگتا ہو گا۔ تم نے اس کی نسل ختم کر دی۔“

”نسل بالکل ختم نہیں کی۔“ یار محمد نے واڑھی پر ہاتھ پھیرا ”بھئی وہ مادہ نہیں نہ ہرن تھا“ ”اس کے باوجود وہ دو چار دن تو زندہ رہتا اور اوسر اس سامنے والی ندی کے کنارے شام ڈھلے جب وہ پانی پیئے آتا۔ تو۔۔۔“

لیکن یار محمد ہرنوں کے معاملے میں مرد ہوا تھا اور اس پر ہمارا کلام نرم و نازک بے اثر ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ شائبہ بھی نہ تھا کہ اس نے آخری ہرن کو ہلاک کر کے کوئی جرم کیا ہے۔ بلکہ ایک معمولی ہرن کے لئے ہماری بے پناہ فکر مندی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اور جب ہماری فکر مندی اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تو کہنے لگا ”ضائع تو نہیں کیا ہے۔ اس میں سے منگ ٹانڈ نکالا اور پھر گوشت سب کو کھلایا۔ آپ بھی اگر کل شام آتا تو گوشت کھاتا۔۔۔۔۔۔“

”اور اس منگ کی تھیلی کہاں ہے؟“

”گھر میں ہے۔۔۔“

”اسے کیا کرو گے؟“

”تھوڑی سی منگ تو گھر میں رکھے گا خوشبو کے لیے۔۔۔ پھر تھوڑی سی منگ سے ایک کشتہ بنائے گا اور باقی چار پانچ سو میں بیچ دے گا۔“

یار محمد نے نہ صرف ایک ہرن مارا تھا بلکہ ایک ایسا ہرن مارا تھا جسے انگریزی میں ”مسک ڈیئر“ کہتے ہیں اور بہت نایاب نسل ہے۔ میں نے بچپن میں جغرافیہ کی ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ مسک ڈیئر ہالیوڈ کے دامن میں پایا جاتا ہے۔ اور نانگا پریت ہالیوڈ میں تھی۔ یار محمد نے نانگا پریت کا جغرافیہ لفظ کر دیا تھا۔

اگر ہم منگ ٹانڈ والے ہرن کا قتل بھول جائیں تو یار محمد بہت نہیں آدمی تھا۔ اور ہاں ایسے ہرن کے منہ سے دو سفید دانت باہر نکلے ہوتے ہیں اور یوں شکاری دور سے جان لیتے ہیں کہ اس کے اندر منگ ٹانڈ ہے۔

”شکاری یار محمد اور لالتوبو کا آخری ہرن اور نانگا پریت کی جھیل“

شکاری یار محمد نے ابھی کل شام لالتوبو کا آخری ہرن مارا تھا۔۔۔۔۔۔ اور اب وہ درختوں کی شاخوں تلے جھکتا کہیں پھسلتا اور کہیں ”احتیاط صاحب“ کا مشورہ دیتا اس پہاڑی پر چڑھ رہا تھا جس کے پاؤں میں ہمارا خیمہ تھا اور ہم رک کر جب کبھی دیکھتے تو وہ پہلے سے مزید چھوٹا نظر آتا کہ ہم آہستہ آہستہ بلند ہو رہے تھے۔ یہ پہاڑی اتنی چھوٹی نہ تھی جتنی کہ خیمے سے نظر آتی تھی۔

اور ہم پہاڑی پر کیوں چڑھ رہے تھے؟ اس لیے کہ اس کے اوپر جو بگیشیز تھا نانگا پریت کا ایک حصہ تھا اور اس کے اختتام پر ایک جھیل تھی۔ اور جھیل میں کشش ہوتی ہے۔ اور میں نے ایک گائیڈ بک میں پڑھا تھا کہ اسے نانگا پریت کی اکلوتی جھیل کہا جاتا ہے۔

ہم شکاری یار محمد سے زیادہ خوش نہ تھے۔ اگر وہ لالتوبو کے میدان اور چپ میدان میں چوکڑیاں بھرنے والے آخری ہرن کو ہلاک نہ کرتا تو شاید آج ہم اسے جھیل کنارے پانی پر جھکا ہوا دیکھ لیتے۔ اگر نہ بھی دیکھتے تو ہمیں اس کی موجودگی کا احساس رہتا۔ ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ لالتوبو میں ہرن پائے جاتے ہیں۔ لیکن یار محمد کی بندوق نے ہم سے یہ احساس چھین لیا۔

ہم سانس لینے کے لیے رکے۔

یار محمد آج اس وقت ہمارے پاس آیا جب محمود شام کی روٹی لینے کے لیے چپ میدان کی طرف چلا گیا تھا اور سلطان ہمارے کہنے پر دیوسائی میدان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گیا تھا۔ ویسے سلطان اس بات پر راضی تھا کہ وہ دیوسائی عبور

ہمارا خیال تھا کہ اوپر جمیل ہے تو جمیل کو کوئی چھوٹا موٹا راستہ جاتا ہو گا لیکن یہاں کچھ بھی نہیں جا رہا تھا صرف ہم جا رہے تھے یار محمد کے پیچھے پیچھے اور جمیل دیکھنے کے فیصلے پر پشیمان ہو رہے تھے کیونکہ یہاں بھی درختوں اور جھاڑیوں کے باوجود پاؤں اوپر کی بجائے اوپر ہڑنے سے فوری طور پر نیچے نیچے تک پہنچا جا سکتا تھا۔ بالآخر جھاڑیاں ختم ہوئیں اور ایک خشک کنارہ دکھائی دیا اور ہم اس پر بمشکل چڑھے۔ اور جب کنارے کے اوپر پہنچے تو وہاں بھی معاملات پیچیدہ تھے کیونکہ یہاں بیٹھنے یا شرافت سے کھڑے رہنے کے لیے جگہ نہ تھی۔ اور وہاں سے دوسری جانب جمیل تھی۔ اور جمیل تک پہنچنے کے لیے سوائے الٹ بازیاں لگاتے ہوئے لڑھکتے جانے کے اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ کیونکہ بھر بھرے پتھر تھے اور راستہ نہ تھا۔ اور پھر جمیل بھی نیلے رنگ کے پانی کی تھی اور اس کے کنارے خشک تھے۔ بڑی سخت مایوسی ہوئی کہ ٹانگا پریت کی اکلوتی جمیل اور اس کی یہ شکل صورت اس سے تو سنہریال کے نزدیک ایک گھاؤں کے چھپر زیادہ خوبصورت تھے۔ لیکن یہاں اس کنارے سے اگر آپ اپنے آپ کو زیادہ دیر تک وہاں معلق رکھ سکیں تو ٹانگا پریت سے آپ براہ راست مخاطب ہوتے ہیں کیونکہ وہاں یا وہ ہے یا آپ ہیں۔ ایک گھیشیر براہ راست نیچے آتا ہے اور پھر آخر میں صرف پتھر رہ جاتے ہیں اور گھیشیر کے پانیوں سے یہ جمیل وجود میں آتی ہے۔ یہاں ہم نے چند تصویریں بنائیں اور میں نے رانی کو بڑی مشکل سے اس بات پر راضی کیا کہ وہ اپنے معمول کے پوز یعنی اکڑے ہوئے سمورائے جاپانی انداز میں کمر پر ہاتھ رکھ کر ٹانگا پریت کو گھورتا ہوا تصویر نہ اتروائے کیونکہ اگر اس نے ایسا کیا تو تصویر صرف ٹانگا پریت کی آئے گی۔ اور اس کی جو تصویر ہمارے پاس ہے اس میں ہم مسکرا تو رہے ہیں لیکن اندر سے ہماری روح قبض ہو چکی ہے کہ جس مقام پر ہم معلق ہیں اگر ذرا سانس گمرا لیا یا ہوا کا جھونکا آیا تو کہاں جائیں گے۔

ٹانگا پریت پر ہلکی دھند اور بادل تھے اور یہ بادل پھیلنے ہوئے ہم تک آ رہے تھے۔

”اچھا جمیل ہے؟“ یار محمد نے پوچھا۔

”ہاں اچھا جمیل ہے۔“

”تو پھر واپس چلیں؟“

اب جو میں نے پلٹ کر نیچے لاقیو میدان کو دیکھا ہے تو روح جو قبض ہونے

سے بچ گئی تھی، فنا ہو گئی۔ لاقیو کو جیسے ہم ہوائی جہاز کی کھڑکی سے دیکھ رہے تھے۔ ہمارا خیال ایک ذرہ دھبہ۔ ندی ایک سرسبز اور کسی دریا کی خشک گذرگاہ ایسے میدان میں ایک چمکتی لکیر اور ان سے پرے روپل پیک اور لالی پیکٹ۔ اور اوپر بھی اترائی اتنی ہی جان لیوا تھی جتنی جمیل کی جانب۔

”یار محمد تم تو کہتے تھے کہ جمیل کو باقاعدہ راستہ جانا ہے۔ اور تم ہمیں اس خوفناک چڑھائی پر سے لے کر آئے ہو۔ دیکھو ہاں ہمارے ساتھ ایک بچہ ہے یہ کیسے اترے گا یہاں سے؟“

اس موقع پر بچہ مسکرایا اور رب اس کا بھلا کرے اس نے یہ نہیں کہا کہ ابو میں تو اتر جاؤں گا آپ اپنی فکر کریں۔

”تو پھر اوپر نیچے جمیل کو جاتے ہیں اور اوپر سے جا کر نیچے جائیں گے۔“ یار محمد نے فیصلہ دیا اور اپنی بددق کو نیکتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ یہاں بھی ٹریکینگ کا وہی اصول لاگو ہوتا تھا کہ بھر بھری اور کنکروں والی سطح پر اتنی دیر پاؤں نہ رکھو جتنی دیر میں وہ پھسل جائے۔ چنانچہ شکاری ان کنکروں پر سکی انگ کرتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔ پھر میر، رانی اور آخر میں۔۔۔ مابدولت!۔۔۔ یہاں مشکل سے جان بچی۔ کیونکہ قدم رکھتے ہی کنکروں اور پتھروں کے ساتھ آپ کا پاؤں نیچے جاتا ہے اور اگر آپ اپنا بیلنس قائم رکھ سکیں تو سات آٹھ فٹ کے بعد کھڑے ہونے کا موقع مل جاتا ہے ورنہ۔۔۔ ورنہ ساما نیلم!۔۔۔ جس مقام پر ہم تھے وہاں سے ہم گھیشیر کی گذرگاہ تک پہنچے اور پھر پانی اور برف سے بچتے جمیل کے پاس آ گئے۔

اور یہاں ہم جمیل کے بد رنگ پانیوں اور اس کی شکل کو بھول گئے کیونکہ یہاں صرف آپ کے لیے ایک مکمل تھائی پتھر تھی۔ اس تھائی میں دنیا سے کٹ جانے کا خوف بھی تھا اور اس میں گم ہو جانے کی خواہش بھی۔ جمیل چونکہ خشک ٹیلوں کے اندر تھی اس لیے یہاں صرف ٹانگا پریت کو ہی سراٹھا کر دیکھا جا سکتا تھا۔

اوپر سے کبھی کبھار کوئی بڑا پتھر لڑھکتا ہوا آتا اور جمیل میں گر جاتا۔ اور یہ پتھر گھیشیر کی اس گذرگاہ میں سے گرتے تھے جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم چلے آ رہے تھے۔

دھوپ صرف آخر میں تھی اور باقی پانیوں پر کنارے کا سایہ تھا۔ دھوپ والا حصہ نیلا تھا اور جہاں سایہ تھا وہاں نیلاہٹ کا شائبہ ہوتا تھا۔ اور سائے میں سردی بڑھتی جاتی تھی۔ ہماری بیٹکس اور اونٹی ٹوپیاں ٹانگا پریت سے اترتی ہلکی ہوا

کے سامنے ٹانگہ ثابت ہو رہی تھی۔ یار محمد نے جمیل کے پانی سے وضو کیا اور ایک بڑے پتھر پر چڑھ کر عصر کی نماز پڑھنے لگا۔ جب وہ سجدے میں گیا تو وہ اکیلا نہ تھا میرے احساسات اس لمحے میں اس کے ساتھ تھے اور میری پیشانی بھی اس پتھر کو چھو رہی تھی۔ جمیل پر سکوت تھا اور جب کبھی میں گلا صاف کرنے کے لیے کھانسا تو آواز پانیوں پر تیرتی دور تک جاتی۔ راضی مجھ سے الگ ہو کر اپنے آپ میں گم تھا اور وہ بھی اس تھانی میں تھا جو مکمل تھی۔

اوپر پتھروں کے لڑھکنے کی آواز آتی۔ پھر ایک آدھ پتھر رفتار پکڑتا اور کہیں ختم جاتا۔ یار محمد ایک مرتبہ پھر سجدے میں گیا تو میں نے اس پر سایہ قلعن تیرتی دھند اور بادلوں میں نمودار ہوتی ٹانگا پریت کی بلندیوں کو سر اٹھا کر دیکھا۔ یار محمد نے اتنی عظیم اور اتنی بلند چوٹی کو سجدہ نہیں کیا تھا بلکہ اس کو سجدہ کیا تھا جس نے اس چوٹی کو تخلیق کیا۔ وہ اس سے ذرہ بھر خائف نہ تھا مرعوب نہ تھا۔ تو پھر اس کے لئے ٹانگا پریت کی کیا حیثیت ہے۔

کوہ پیادوں کے مطابق ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے ایک طویل اور پرخطر راستہ ہے اور وہ دنیا کی بلند ترین چوٹی ہے۔

کے نو دنیا کی دو سری بلندی ترین چوٹی ہے اور اس کے ہیں کیپ تک پہنچنے کے لیے پندرہ دن مسلسل سفر کرنا پڑتا ہے۔ کے نو جسے شاہ گوری کے خوبصورت نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

ایورسٹ اور کے نو کے بعد بلندی کے لحاظ سے کینچن چنگا کا نام آتا ہے۔ ماکلو اور لوٹسے کا نام آتا ہے۔ لیکن دنیا کی نویں بلند ترین چوٹی ٹانگا پریت کوہ پیادوں کی ذاتی دنیا میں سب سے بلند ہے۔ کیونکہ ایورسٹ اور کے نو کے مقابلے میں ٹانگا پریت کو سر کرنا زیادہ مشکل ہے۔ یہ بلند ترین نہیں لیکن دنیا کی خطرناک ترین چوٹی ہے۔ ”دسے کلر ماؤنٹین“ جس نے انسانوں کو کبھی زیادہ نزدیک آنے کی اجازت نہیں دی۔ سب سے زیادہ کوہ پیادہ اور پورٹ اس کی برفوں میں دفن ہیں۔

کچھ لوگ اسے منحوس چوٹی کہتے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ اس کے نزدیک جانے والے سحر کا شکار ہو جاتے ہیں۔

باہر کی دنیا کو آٹھ ہزار ایک سو پچیس میٹر بلند ٹانگا پریت کے وجود کی خبر انیسویں صدی کے نصف میں شلا گن وٹ نامی دو جرمن بھائیوں نے دی۔ ان میں سے ایک بھائی کاشغر میں قتل کر دیا گیا۔ ٹانگا پریت کے قہر کا آغاز

۱۸۹۵ء میں برطانوی کوہ پیادہ۔ ایف مری ٹانگا پریت کو زیر کرنے کے لیے آیا۔ اپنے گورکھا پورٹر دیکھو کے ساتھ چوٹی کے نزدیک پہنچا لیکن اسے سر نہ کر سکا۔ یہی اسے۔ ایف مری پراسرار طریقے سے ٹانگا پریت کے آس پاس گم ہو گیا۔ کہاں گیا؟ آج تک نہیں معلوم ہو سکا۔

۱۹۳۲ء میں دلی مرگل کی قیادت میں ایک ٹیم آئی۔ ناکام ہو کر واپس چلی گئی۔ راستے میں مصر کی سیر کے لیے قاہرہ میں قیام کیا۔ ٹیم کا ایک ممبر وینڈ ہرن اہرام مصر میں سے ایک کی چوٹی پر گیا وہاں سے گرا اور فوت ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بھی ٹانگا پریت کا ہاتھ تھا جو اہرام تک پہنچ گیا۔

انہی دلی مرگل صاحب کو جین نہ آیا اور ایک مرتبہ پھر ایک مہم کے ساتھ ۱۹۳۳ء میں اوہر تشریف لے آئے۔ چوٹی کے قریب پہنچ چکے تھے کہ موسم خراب ہو گیا۔ مرگل کے علاوہ دو کوہ پیادہ اور چھ نیپالی شہزادوں کو برف کی قبریں نصیب ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ مرگل کا پورٹریکیے اپنے آپ کو بچا سکا تھا لیکن اس نے اپنے صاحب کے ساتھ فوت ہو جانا زیادہ پسند کیا۔

عام طور پر ایورسٹ کو انگریزوں کی چوٹی۔ کے نو کو امریکیوں اور جاپانیوں کی چوٹی اور ٹانگا پریت کو جرمنوں کا پہاڑ کہا جاتا ہے۔ اور اسی لیے آدھا جرمنی اس پر دفن ہے۔ ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر کارلو وائن ایک مہم لے کر یہاں پہنچا۔ تقریباً بیس ہزار فٹ کی بلندی پر ایک نہایت محفوظ جگہ پر کیپ لگایا۔ رات کو برف کا ایک بہت بڑا تودہ نیچے گرا اور پوری ٹیم کو اپنی آغوش میں لے کر سرد موت سے ہمکنار کیا۔ کل سولہ کوہ پیادہ اور پورٹریکام آئے۔

پال ہار ۱۹۳۸ء میں اوہر آئے۔ ان کی مہم بالکل خیر و عافیت سے رہی۔ صرف یہ ہوا کہ چوٹی کی جانب چڑھتے ہوئے یکدم برف کے نیچے سے چار برس پہلے دفن شدہ مرگل اور ان کا پورٹریکیے ظاہر ہو گئے۔ سردی کی وجہ سے ان کی لاشیں بالکل محفوظ تھیں اور لگتا تھا کہ ابھی ”گولڈ مارٹنک“ وغیرہ کہہ دیں گے۔ انہیں دیکھ کر پورٹریک حضرات اتنے خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے صاحب لوگوں کا سامان چھوڑا اور غائب ہو گئے۔

۱۹۳۹ء میں پیٹر اور گٹنائر نے ایک مہم کی قیادت کی، ناکام رہے، جانی نقصان تو نہ ہوا لیکن دوسری جنگ عظیم چھڑنے کی وجہ سے برطانوی ہمالیہ سے بھاگ کر تبت میں دلائی لاما کے ہاں پناہ گزین ہوئے۔ پیٹر صاحب کا تعلق ہٹلر کے کے جرمنی سے

اور پھر ۱۹۵۳ء میں ایک اور جرمن ٹیم ڈاکٹر ہرلگ کوفر کے زیر قیادت ٹانگا پریت کے رائے کوٹ رخ میں فیری میڈو کی جانب سے یہاں پہنچی۔ اس بار بھی موسم استوائی مہدوش تھا۔ ٹیم کو واپس ہو جانے کا حکم ملا۔ لیکن اس وقت جرمن بولن سات ہزار میٹر کی بلندی پر ایک چھوٹے سے خیمے سے چوٹی کا جائزہ لے رہا تھا اور وہاں سے اس نے اپنی کوشش کا آغاز کیا اور تن تھا کیا۔ بقول میسنر ”یعنی شکست کے سامنے ایک ایسا شخص تھا جو ایک تخیل کے زیر اثر تھا۔ ایک خوفناک مہم جو کہ بیانی کے تمام اصولوں کی نفی کرتی تھی اور جس میں کامیابی کا ذرہ بھر امکان نہ تھا۔ یہ تمام ہالیائی تجربوں کی نفی تھی اور اس کے باوجود جرمن بولن ٹانگا پریت پر قدم رکھنے والا پہلا انسان تھا“

بولن کے بعد متعدد افراد نے ٹانگا پریت کو زیر کیا اور ان میں سے کم از کم ایک درجن جرمن تھے اور ان میں سے کم از کم چھ کی موت پر اسرار حالت میں ہوئی۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ ٹانگا پریت سچ سچ منحوس ہے؟۔ میسنر کہتا ہے ”یہ کہنا کہ ٹانگا پریت منحوس ہے استوائی لغو بات ہے۔ وہاں کوئی خوفناک وجہ نہیں ہے“ صرف یہ ہے کہ ٹانگا پریت ہم قافی انسانوں کی نسبت ناقابل یقین حد تک عظیم ہے“ اور اب ہم کوہ بیانی کی اس حیران کن داستان کی طرف آتے ہیں جس کے مرکزی کردار تین تھے۔ دنیا کا مشہور ترین کوہ بیانی وائن ہولڈ میسنر اس کا بھائی گنٹھر میسنر اور۔۔۔ ٹانگا پریت۔۔۔

میسنر ایک ایسا کوہ بیانی ہے جسے انگریزی زبان میں ”آل ٹائم گرینٹ“ کہا جاتا ہے۔ ایک محیرا عقل کوہ بیانی جس نے دنیا کی تمام تر بلند ترین چوٹیاں آکسیجن کے بغیر سرکیں اور تن تنہا سرکیں۔۔۔

۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر ہرلگ کوفر ایک ایسی استوائی تجربہ کار ٹیم کا لیڈر تھا جس میں دونوں میسنر بھائی شامل تھے۔ میسنر لکھتا ہے ”اس مہم کے پانچ کوہ بیانی مرکل گلی تک پہنچ گئے جس کے سامنے چوٹی کا چہرہ ہے۔ جب موسم کی خرابی کی وجہ سے میں نے اکیلے ہی چوٹی تک جانے کا فیصلہ کیا تو میرا بھائی اپنی مرضی سے میرے ساتھ چل پڑا اور ہم دونوں ٹانگا پریت پر پہنچ گئے چونکہ بلندی کی وجہ سے گنٹھر شدید بیمار ہو گیا اس لئے میں نے مجبوراً روپل سائڈ کی بجائے دوسری جانب دیا میری طرف اترنا شروع

کر دیا“ میرا خیال تھا کہ ہم اوپر سے آسانی سے اتر جائیں گے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ ایک المناک فیصلہ ثابت ہوگا۔“

دوسری جانب اترتے ہوئے میسنر کا بھائی گنٹھر ایک برقانی تودے کی زد میں آکر دفن ہو گیا اور میسنر بھوکا پیاسا، سردی کی شدت سے بوکھلایا ہوا نیم پاگل حالت میں ٹانگا پریت کے دیا میرے میں بھٹکتا رہا۔ اور بالآخر مائنڈ چونٹوں کے دامن میں پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سردی کی وجہ سے بیکار ہو چکے تھے اور تب کچھ چڑا ہوں اور کسانوں نے اس کی مدد کی اور گلگت تک پہنچایا۔ کہتے ہیں کہ میسنر جب پاگل پن اور سردی کی شدید کیفیت میں جنگل کے آغاز میں تھا تو اس نے جمونیوں پر عورتوں مردوں اور بچوں کے چہرے حرکت کرتے دیکھے جو اسے دیکھتے تھے کہ یہ کون ہے کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ میسنر کے نزدیک دیا میر کا یہ علاقہ جہاں وہ مرتا مرنے لگا تھا اس کا نیا بچپن تھا، اس کی دوسری جائے پیدائش تھی۔۔۔

”اس مہم کے دوران میں موت سے ہٹنا ہوا۔ میری مراد جسمانی موت سے نہیں بلکہ روح کے خاتمے سے ہے۔ امیدوں اور ارادوں کی موت۔۔۔“ وطن واپسی پر میسنر کو بھائی کی موت کا ذمہ وار ٹھہرایا گیا۔ اور اس پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے۔ کہا گیا کہ دیا میر کی جانب اترنے کا فیصلہ صرف میسنر کا تھا اور اس کی وجہ سے اس کا بھائی مارا گیا۔

”ٹانگا پریت کو سر کرنے کے بعد میرا بھائی مجھ سے پچھڑ گیا۔ میں اکیلا گھر واپس گیا اور میں ایک مختلف انسان تھا۔ پچھلے برسوں میں مجھے بے شمار الزامات کے جواب دینے پڑے“ مجھے اپنا دفاع کرنا پڑا۔ لیکن اب میرے اندر زیادہ کڑواہٹ نہیں رہی۔ صرف ایک اداسی باقی ہے کہ میں نے اپنے بھائی کو کھو دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں نے ٹانگا پریت کو سر کر لیا ہے اور اس کے بعد لوگوں کے الزامات کے سامنے شکست خوردہ نہیں ہوا تو مجھے دنیا کی کوئی چیز شکست نہیں دے سکتی۔ لیکن شاید یہ یقین بھی سراپ ہے اس کے آگے سر جھکانا خود فریبی ہوگی۔ اس لئے میں اس باپوسی کے لئے تیار ہوں جو ہر حال میرے سامنے آئے گی۔ ایک ایسی باپوسی جو ہر طور انسانی وجود کی قسمت میں لکھی ہے۔“

وائن ہولڈ میسنر کی ایک کتاب ”دی بگ والٹر“ میں اس کے بھائی گنٹھر کا ایک خط درج ہے جو اس نے اپنے ماں باپ کو اس مہم کے دوران ٹاپ میدان کے ایک

میں کیمپ سے نکلا۔ وہ لکھتا ہے "۔ ٹانگا پریت کی چوٹی کے اوپر تک برف پھیل چکی ہے اور ٹاپ میدان بالکل سرسبز ہو چکا ہے۔ یہاں ہر جانب پھول ہی پھول ہیں اور کئی جگہوں پر لگتا ہے کہ ہم کسی کے پھولوں بھرے جمونپڑے میں آ گئے ہیں۔ پاک کے نیم جنگلی ریوڈ اس رومانوی وحشی پیالا نما بلند وادی میں گھومتے ہیں اور دبے اور مرل گھوڑے شدید سردی کے ستارے ہوئے یہاں گھاس چرنے آ جاتے ہیں۔ ٹاپ میدان ایک چراگاہ ہے اور بالکل ہموار ہے۔ درمیان میں درخت ہیں۔ آندھیوں اور برف کے طوفانوں کے نشان اب بھی باقی ہیں۔ ہر دوسرا درخت چوں کے بغیر ہے اور سوکھا ہوا ہے۔ ہر شام پورنر اس قسم کے پانچ چھ درخت جمع کرتے ہیں اور الاؤ جلاتے ہیں۔ شمال کی جانب ہمارے عین اوپر ٹانگا پریت کا روپل چروہ ہے جو قدموں سے چوٹی تک ساڑھے چار ہزار میٹر بلند ہوتا ہے۔ ٹاپ میدان کے مغرب اور مشرق میں گیشیر کی دیواریں ہیں اور جنوب میں روپل کی چوٹی وادی پر سایہ کرتی ہے۔ دھند ٹاپ میدان پر جھکی رہتی ہے اور اکثر بوند باندی ہوتی رہتی ہے۔ آج ہم نے دو سو روپے میں ایک پاک خریدا ہے جسے ہم روسٹ کریں گے۔ آپ خط ضرور لکھیں کیونکہ چوتھے پانچویں روز ترشک کا ایک کسان ہماری ڈاک لے کر آتا ہے۔ خدا حافظ۔"

سکمر کا اپنے ماں باپ کو یہ آخری خدا حافظ تھا کیونکہ ٹھیک چندرہ روز بعد وہ ٹانگا پریت کی برفوں میں گم ہو گیا۔

آج تقریباً انیس برس بعد ہمارے نیچے ٹاپ میدان میں برف پھیل چکی تھی اور ہر جانب ہریا دل تھی۔ پاک یا زہ اس رومانوی پیالا نما وادی میں گھوم رہے تھے اور دو دبے سے گھوڑے گھاس چر رہے تھے۔ درمیان میں درختوں کا ذخیرہ تھا اور دھند ٹاپ میدان پر جھکی ہوئی تھی۔

ہمارے سروں پر ٹانگا پریت کا روپل چروہ تھا۔ ہمارے قدموں سے چوٹی تک ساڑھے چار ہزار میٹر بلند دنیا کا سب سے بڑا چٹانی چروہ۔ یا راک فیس۔ پتھروں کے لڑھکنے کی آواز اب بھی آرہی تھی۔ کبھی کوئی پتھر رفتار پکڑتا اور پھر کیس ختم جاتا۔ ٹانگا پریت کی اس جھیل کا مقامی نام "سروٹ" ہے۔

یار محمد نے سلام بھیرا۔ دعا کی اور اٹھ بیٹھا۔ اس نے پتھر سے اٹھے ہوئے پکڑے نہیں جھاڑے شاید اس لئے کہ وہاں مٹی نہ تھی۔

"کوہ پیماؤں کا قبرستان جہاں ہوا تیز چلتی تھی"

جھیل سے واپسی پر یار محمد کو ایک پگندڑی مل گئی اور ہم اطمینان سے نیچے لاقوہ میں اتر آئے۔ ہمارے نیچے کے سامنے ندی کے ساتھ متعدد زندہ سر جھکائے گھاس چر رہے تھے اور ان سے پرے لاقوہ گاؤں کے چند نیچے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ اور کچھ بچے بڑے پتھر پر بیٹھے آپس میں سر جوڑے ہنس رہے تھے۔ وہ میرے ملنے کے لئے آئے تھے۔

لاقوہ میں شام ہو رہی تھی۔ ڈھلوان پر بنے چرواہوں کے جمونپڑوں کے درمیان میں ایک بہت بڑا بازار تھا اور چند عورتیں مویشیوں کو اس کے اندر لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں اور وہ اس دوران "ہو ہا ہے ہے" کی وہ زبان بول رہی تھیں جو دنیا بھر کے مویشی سمجھتے ہیں۔ ان کے چیخنے کی آوازیں مدہم ہو کر مجھ تک پہنچی تھیں۔

میر نے لاقوہ کے بچوں کو دوست بنا لیا تھا اور وہ انہیں اپنے واک مین پر مغربی موسیقی سنوا رہا تھا۔ وہ اپنا ہیڈ فون باری باری ہر بچے کے کان کے ساتھ لگا آتا اور اس بچے کے چہرے پر نمودار ہونے والے احساسات سے لطف اندوز ہوتا۔

سلطان اسی بڑے پتھر "بابا جی" کی اوٹ میں سکڑ بیٹیوں کی طرح برتن سجائے چولے میں پھونگیں مار رہا تھا۔ محمود روٹیوں اور دیو سائی کے بارے میں معلومات کے ساتھ واپس آ چکا تھا۔

سلطان نے قورے کے ایک ٹین کو اہل کر جب کھولا تو اس کے تیز مصالحے کی خوشبو لاقوہ کی صاف شفاف فضا میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ راہی جو نیچے ندی تک

گیا تھا واپس آیا تو ناک چڑھا کر بولا "مارٹ صاحب پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ میں شادی پر آگیا ہوں۔"

"شادی پر؟"

"ہاں۔ خوشبو ہوتا ہے ناں کھانے کا تو ایسا ہوتا ہے جو ادھر آتا ہے۔" اس نے پھر فضا میں سو گھٹا۔

"جناب رانی چاچا یہ قورے کی خوشبو ہے۔ آج شام کھانے پر ملے گا۔"

"نہیں۔ اس میں مری ہو گا۔ ہم نہیں کھائے گا صرف سونگھے گا۔"

چنانچہ میں نے اور میر نے محمود کی لائی ہوئی روٹیوں کے ساتھ تیز مصالحے والا قورہ کھایا اور خوب کھایا۔ رانی اپنے پچکے دال چاول کو حسب سابق نہایت ادب اور سنجیدگی سے کھاتا رہا۔

اور پھر کھانے کے بعد کافی۔ ہم سب آہستہ آہستہ آگ کے نزدیک چلے گئے۔ یہاں بڑے پتھر "باباجی" کی اوٹ میں سردی اور ہوا سے بچاؤ بھی ہوتا تھا۔

تمام چینی کا مک میری دونوں ہتھیلیوں کے درمیان کافی سے بھرا ہوا اور اس کی حدت میرے بدن میں منتقل کرتا ہوا۔ سامنے چولہے میں آگ اور کبھی ہوا یکدم تیز ہوتی تو آگ کی گرمی کو لمحہ بھر کے لئے سمیٹ لے جاتی۔ گڈریے ابھی تک اپنے موسیٰ باڑے میں ہانک رہے تھے اور سردی نیچے آ رہی تھی۔ اور تب دیو سائی کی بات شروع ہو گئی۔

محمود کے پاس تمام خبریں تھیں "صاحب میں نے یہاں جتنے لوگ ہیں ان سے بات کی ہے۔ دو چرواہے تو ابھی کل دیو سائی سے اتر کر آئے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ابھی جو ادھر کالا پانی ہے اس پر پل نہیں بنا اور اس میں سے پیدل گزرتا پڑتا ہے۔"

"کیا ہم تینوں اس میں سے گزر سکتے ہیں؟"

"اگر آپ ایک دوسرے کو رسے کے ساتھ بانڈھ لیں پھر آسان ہو جائے گا کیونکہ پانی اتنا تیز ہے کہ ہر سال ایک دو آدمی ہمالے جاتا ہے۔"

"نہیں۔" میں نے سر ہلایا۔ "میں میر کے ساتھ اس قسم کا رسک نہیں لے سکتا۔ اسے عبور کرنے کا اور کیا طریقہ ہے؟"

"گھوڑے جناب۔ آپ کو اگر چار گھوڑے مل جائیں تو آپ سلمان سمیت یہاں سے چل کر دیو سائی پار کر کے ادھر سکرو میں اتر سکتے ہیں۔ لیکن گھوڑے منگے ہیں ایک بوڑھے کے پاس دو گھوڑے ہیں اور وہ ہزار روپیہ فی گھوڑا مانگتا ہے۔ اس

کے علاوہ اس کی شرط یہ کہ آپ اس کے دو آدمی پورٹ کے طور پر ساتھ لے جائیں۔"

"لیکن ہم تو ہمیں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔"

"صاحب آپ جو گھوڑے لے کر جاؤ گے تو وہ ادھر ٹاپ میدان میں واپس لانے کے لئے بھی تو کوئی آدمی چاہئے۔ بوڑھے کو ہم پر اعتبار نہیں۔ ویسے ایک گھوڑا میرے پاس بھی ہے لیکن ابھی جنگل میں گیا ہے۔ کل آجائے گا۔"

"کیوں رانی۔ کیا خیال ہے؟"

"آپ ہاں ہوں۔ ہم کو کیا پتہ کدھر جانا ہے کیسے جانا ہے۔ جدھر لے جاؤ گے چلے گا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تم چوتھے گھوڑے کا بندوبست کرو لیکن ہم ہر گھوڑے کے ساتھ ایک اور پورٹ لے جانا افورڈ نہیں کر سکتے۔"

میر کے چپکے چپکے نین نقش آگ کی روشنی میں دیکھتے تھے "ابو کیا ہم واقعی گھوڑوں پر سز کریں گے؟"

"ایک خرابی ہے صاحب" سلطان زمین کھینچتا ہوا بولا "آپ کا ٹینٹ بیکار ہے جی۔ اگر ادھر بارش ہو گیا تو ادھر بھی بیکار ہے۔ اور ادھر دیو سائی پر اگر تو موسم ٹھیک ہے تو پھر شاید گزارہ ہو جائے اور اگر بارش ہو گیا تو پھر بہت مشکل ہے جی اس ٹینٹ میں رات گزارنا۔ برف ہو جائے گا صبح تک۔"

"ٹینٹ برف ہو جائے گا؟"

"ہاں ناں۔ اور اس کے ساتھ جو اس میں سوئے گا وہ بھی۔"

"اور اگر برف باری شروع ہو گئی تو بالکل خطرہ ہو جائے گا" محمود بولا۔

"تم گھوڑوں کا بندوبست کرو ٹینٹ کے بارے میں پھر سوچیں گے۔"

"اچھا صاحب میں کل اس بوڑھے سے پھر بات کروں گا۔" محمود نے سر ہلایا۔

اور پھر کچھ سوچ کر مسکراتے لگا "صاحب آج ادھر ہماری ہنک میں جا پانی لوگ آیا ہیں کیپ سے۔ آپ کو بولا تھا ناں کہ ان کی ایک لڑکی کا ٹانگ ٹوٹ گیا ہے تو ہم سے چار پائی مانگتا تھا تاکہ اسے اٹھا کر ترشک لے جائے۔ لیکن ادھر پورے ٹاپ میدان میں انہیں چار پائی نہیں ملا۔"

"کیوں؟"

"ادھر تو ہنک ہے صاحب۔ مگر نہیں۔ ادھر چار پائی نہیں لاتا۔ زمین پر سوتا

ہے۔

”ان جاپانیوں کے پاس سڑیچر نہیں ہے؟“

”خدا معلوم۔“

آگ ٹھنڈی ہونے لگی۔ میں نے دیکھا کہ سیر کے چرے پر تھکاوٹ کے آثار
 نوجھے تھے۔ ”تم جا کر سو جاؤ بیٹا“

”نہیں ابو۔“ اس نے نیند میں ڈوبتے بچے کی ایک بیوقوف سی مسکراہٹ
 کے ساتھ کہا ”مجھے نیند تو نہیں آ رہی“

”صاحب آپ اوہر لاقبہ میں کتنے روز ٹھہرے؟“ سلطان نے پوچھا۔

”تین چار روز۔“

”صاحب مجھے آپ کے ٹینٹ کا بہت فکر ہے۔ اوہر اگر بارش ہو گیا تو بہت
 سردی ہو گا۔ بہت زیادہ سردی ہو گیا تو ہم آپ کو محمود کی بمک میں لے جائے
 گا۔ صاحب آپ مافضہ کیوں نہیں گیا؟ اوہر تو جو صاحب آتا ہے اوہر جاتا ہے۔“
 ”جی بات ہے سلطان ہم نے تو مافضہ پاس کا ٹیم ترشک میں آکر سنا۔ تم مجھے

ہو؟

”ہاں ہاں۔ جاتا رہتا ہے۔ دیکھو صاحب اگر تم دیو سائی نہیں جاتا تو پھر اوہر
 سے مافضہ چلے جاؤ۔ ترشک سے آٹھ کیمپ بنتا ہے۔ ترشک سے روہل۔ لاقبہ۔
 مافضہ پاس میں کیمپ۔ مافضہ ہائی کیمپ، گیشیئر پر۔ مافضہ پاس۔ لوہا۔ جنگوٹ۔ چیلے
 اور نویں دن آپ شاہراہ ریشم پر نکل آئیں گے یو نہریج کے پاس اوہر سے وطن چلے
 جاتا۔“

”نہیں یہ بہت طویل اور پر مشقت راستہ ہے۔ یوں بھی کوہستان کے علاقے
 میں ٹریکنگ کے لئے ذرا جرأت چاہئے۔“

”نہیں صاحب خطرہ نہیں ہے۔ ذرا سخت لوگ ہیں لیکن خطرہ نہیں ہے۔“

”ہم دیو سائی جائیں گے۔ کیوں سیر؟“

”ہاں آں۔ ہاں ابو“ وہ باقاعدہ اونگھ رہا تھا۔

”تو ہم چلا ہے۔“ سلطان اور محمود اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ دونوں بمکوں میں
 رات گزارنے کے لئے جا رہے تھے۔

”پاپ رے۔“ راہی جو بہت دیر سے ٹھنڈی پڑتی آگ کی راگھ پر نظر جمائے
 بیٹھا تھا سر جھٹک کر یکدم بولا ”تو اوہر ہم ٹینٹ میں اکیلا ہو گا۔؟“

”آپ تین ہیں صاحب۔“ سلطان بولا ”لیکن اگر آپ کو ڈر لگتا ہے تو میں اوہر
 باہر سو جاتا ہوں۔“

”نہیں نہیں۔“ راہی فوراً سینہ پھلا کر بولا ”ڈر تو نہیں لگتا لیکن تم نے بولا
 تھا میں کے اوہر بھیڑنا موافق شیر ہوتا ہے۔“

”ہوتا ہے پر وہ کھل سے پرے رہتا ہے۔“ اوہر سلطان نے سر اٹھا کر اس
 بولیلے آسمان کو دیکھا جس کی سفیدی اندھیرے میں تیرتے کسی آنکس برگ کی طرح
 نظر آ رہی تھی۔

”تو بچے تو نہیں آتا ہاں اوہر۔“

”آتا ہے کبھی کبھی۔“ سلطان نے راہی کی فکر مندی سے لطف اندوز ہوتے
 ہوئے کہا ”لیکن وہ سامنے جاتا ہے لاقبہ کے گاؤں میں۔ اوہر اسے بھیڑ بکری مل جاتا
 ہے۔“

”پھر ٹھیک ہے۔“ راہی اطمینان سے مسکرایا ”ہم تو بالکل مزیدار نہیں ہے
 بھیڑ بکری زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔ شیر کو تو پتہ ہو گا۔“

ٹانگا پرست کے بیس کیمپ میں وہ رات حیرت انگیز طور پر زیادہ سرد نہ تھی۔ ہاں
 صبح کے وقت ایک پر سکوت صبح ٹھنڈک کچھ دیر ٹھہری رہی اور پھر دھوپ کی پہلی
 کرنوں کے ساتھ پھیل گئی۔

میری آنکھ کھلی تو نیچے میں سورج کبھی ایسی زرد اور تیز روشنی تھی۔ نیچے کا پردہ
 ہٹا ہوا تھا اور اس میں سے لاقبہ کے میدان کی ہریا دل، سچ بتی سلامت ندی اور ان سے
 پرے روہل پیک اور لالی پیکٹ کی برقی ایک صاف آسمان میں تصویر ہو رہی تھیں۔

بہت سارے بچوں کی دہلی دہلی ہنسی میں سیر کی آواز مجھ تک پہنچتی تھی۔

راہی یوگا کے ایک پوز میں آنکھیں بند کئے اپنے دھیان میں تھا۔

میں سستی سے آنکھیں بند کئے لیٹا رہا مگر میرے پونوں پر نیچے کی روشنی زرد
 تھلی کی طرح بے آواز ٹپٹپٹ تھی۔

راہی کھانا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ اس سفر کے

دوران اسے جب بھی موقع ملتا وہ مجھ سے الگ ہو جاتا۔ وہیں میرے پاس بیٹھا ہوتا
 لیکن مجھے سے الگ ہو کر اپنے دھیان میں ہو جاتا۔ ”کیا ہو رہا تھا؟“

”نماز۔“ وہ ہنس کر بولا

”یہ کس وقت کی نماز ہے چاچا؟“

”بس یہ میری نماز ہے۔“

”کچھ گفتگو وغیرہ ہوتی ہے اوپر والے سے۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں لیکن۔۔۔ بس میں رپورٹ دیتا ہوں۔۔۔ رپورٹ لیتا ہوں۔۔۔“

”موسم کی رپورٹ بھی لے لینی تھی چاچا۔۔۔ ادھر بارش ہو گئی تو یہ خیمہ کانڈ کی

طرح گل جائے گا“

”موسم تو دکھائی دے رہا ہے۔“ اس نے روپل پیک اور لالی پیکٹ کے وسیع

اور شفاف منظر کی طرف اشارہ کیا ”سارے رنگ الگ الگ اور صاف لگ رہے ہیں

جیسے اس نے ابھی ابھی اس کینوس پر لگائے ہوں۔۔۔ موسم ٹھیک ہے“

میں کسما کر سلیپنگ پیک کی کینجلی سے نکلا تو زیادہ چست اور صحت مند

محسوس کر رہا تھا۔۔۔ جاگر پن کر میں خیمے سے باہر آ گیا۔ راہی ندی کی جانب چلا گیا۔

بڑے پتھر بابا جی پر میرے موسیقی کی محفل بجا رکھی تھی۔۔۔ لاقوہ کے بچے

مانیکل بیسکن اور میڈونا کے نفٹے سن رہے تھے۔۔۔ جو بچہ واک مین کا ہیڈ فون پہنے

ہوئے موسیقی سن رہا تھا وہ باقاعدہ سر ہلا رہا تھا۔۔۔

”ابو یہ جو ہے۔“ میرے مجھے آواز دی ”یہ جو موسیقی سن رہا ہے اس کا نام

بھی میرے۔۔۔ لاقوہ کا میسر۔۔۔“

میں نے سامان کی سب سے اہم پوٹلی اٹھائی اور ندی کی طرف اترنے لگا۔۔۔ ظاہر

ہے اس پوٹلی میں دانٹوں کا برش اور نوٹھ پیٹ بھی تھی۔ البتہ شیونگ کا سامان ابھی

بیکار تھا۔ اپنے گالوں پر اگی سخت گھاس ایسی چھوٹی چھوٹی داڑھی پر ہاتھ پھیرنے سے

بہت لطف آتا تھا اور تب ہم نے یہ بھی جانا کہ مولانا صاحبان ہمہ وقت اپنی داڑھی

کیوں سنوارتے رہتے ہیں۔

ساتھ کے کنارے راہی کھڑا تھا اور پانی کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ اور اس کے علاوہ اور

کچھ نہیں کر رہا تھا صرف پانی کو دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“

”گور کر رہا ہوں۔۔۔ پانی پر“

”کیوں؟“

”یہ کتنا ہے منہ ہاتھ دھوئے نہیں دتا۔۔۔ آپ ہاتھ لگاؤ“

میں نے ہاتھ لگایا تو پانی کتنا تو ضرور تھا لیکن ترشک کا پانی تو پاگل کتے کی طرح

کٹا تھا۔۔۔ میں نے بمشکل چند چھینے اپنے چہرے پر مارے۔۔۔ راہی نے اپنے تھیلے میں

سے گلاس نکال کر پانی سے بھرا اور پھر اس کا ایک گھونٹ پی کر کھڑا ہو گیا ”یہ بھی کٹا

ہے۔۔۔ اسے آہستہ آہستہ چائے کی طرح پیوں گا“

”کیا پورا گلاس پینا ضروری ہے؟“

”ہاں۔۔۔ میں روزانہ صبح سویرے ایک گلاس پانی ضرور پیتا ہوں۔۔۔ ایک مرتبہ

میں کانٹن گیا تو ادھر بھی پانی پینا بہت مشکل ہو گیا۔ سوچا کیا کروں۔ پھر میں نے دریا

کے کنارے ایک گھوڑے کو دیکھا۔ وہ پانی پی رہا تھا۔ لیکن وہ تھوڑا سا پیتا تھا اور پھر

گردن اٹھا کر کھڑا رہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گردن نیچی کر کے تھوڑا اور پیتا تھا۔ تو اب

میں بھی ایسے ہی کرتا ہوں۔“

راہی ایک مختلف عادتوں والا مختلف انسان تھا اور بہت اچھا سفری رفیق ثابت ہو

رہا تھا۔ بڑے پتھر کے اوپر میرے محفل بجا رکھی تھی اور اس کے نیچے سلطان نے

ناشتے کے انتظامات کر رکھے تھے۔ گرم بھاپ دینا دودھ اور اس میں کڑکڑاتے کارن

فلیکس بہت ساری چینی اور پھر کافی۔۔۔

”آج قبرستان جائے گا؟“ ناشتے سے فارغ ہو کر سلطان نے پوچھا۔

”نہیں نہیں۔“ راہی اپنا ولیہ نکلتے ہوئے بولا۔ ”خود نہیں جائے گا۔ کبھی نہیں

جائے گا۔ کوئی زبردستی لے جائے گا تو پھر جائے گا“

”ہم لے جائے گا۔“ سلطان کی سادگی راہی کے مزاح تک نہیں پہنچ پاتی تھی

۔۔۔

”تو ہم بھاگ جائے گا“ راہی کہنے لگا۔

”چاچا ڈاکٹن ہو گیا ہے۔“ سلطان تھوڑا سا پریشان ہو گیا۔

”چاچا ڈاکٹن نہیں ہو گیا یہ ذرا مضرب کرتا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی ”آؤ

قبرستان چلیں“

ہم اپنے خیمے سے نیچے اتر کر مل کھاتی ہوئی شفاف ساٹھ کے کنارے کنارے

چلنے لگے۔ اور ادھر کو چلنے لگے جدھر سے یہ آ رہی تھی۔۔۔ لاقوہ کے گاؤں کی طرف

سے۔۔۔ اگر چند جھونپڑیوں اور مویشیوں کے ایک باڑے کو گاؤں کہا جاسکتا ہے تو۔۔۔

یہ ندی بس وہی تھی کہ جس کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو۔ سمیر اپنی لاسپی ٹانگوں کا قاعدہ اٹھاتے ہوئے اسے پھلانگ کر کبھی ادھر ہو جاتا اور کبھی قلعہ بھر کر ادھر آ جاتا۔۔۔ آسمان اتنا نیلا تھا کہ اس کی نیلاہٹ روپل پیک کی سفیدی پر بھی اثر انداز ہو رہی تھی۔ گاؤں کے قریب بڑے بڑے پتھروں کے اندر کوئی چشمہ تھا اور سات ندی یہیں سے جنم لے رہی تھی۔ گاؤں سے پرے تھوڑی سی چڑھائی تھی جس کے بعد ایک اور غیر ہموار علاقہ ہمارے سامنے آ گیا۔

”ادھر ٹیم کیمپ کرتا ہے کیونکہ جگہ بہت ہے۔“

”سلطان کیا تم بھی کبھی ٹانگا پریت پر گئے ہو؟“ سمیر نے دریافت کیا۔

”ہاں ہاں۔۔۔ ادھر۔۔۔ ادھر سے اوپر جاتے ہیں ہاں“ سلطان نے ایک بے آباد ڈھلوان کی طرف اشارہ کیا ”اور پھر ادھر برف کے ساتھ کیمپ دن لگاتے ہیں۔۔۔ اور وہاں جو بڑا پتھر ہے برف میں تو ادھر کیمپ نو لگاتے ہیں۔۔۔ میں کیمپ نو تک گیا ہوں“

”اس سے آگے کیوں نہیں گئے؟“

”اس کے لئے کپڑا چاہئے۔ بوٹ چاہئے۔ میرے پاس نہیں تھا۔۔۔ اس لئے نہیں گیا۔۔۔“

”ڈرا اپنے ٹینٹ کو دیکھو ابو۔“ سمیر آنکھوں پر ہاتھ رکھے لاقب کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ اور یہاں سے اس کی وسعت کا اندازہ ہو رہا تھا۔۔۔ یہاں ہوا زیادہ تیز تھی کیونکہ آس پاس کوئی رکاوٹ نہ تھی اور ہم ٹانگا پریت کے عین سائے میں تھے۔۔۔ سات ندی سے پرے جو ایک زرد و جب درختوں میں گم ہوتا لگتا تھا وہ ہمارا خیمہ تھا۔۔۔

”ماضیو پاس بھی ادھر سے جاتا ہے۔“

۔۔۔ اور ہم روپل پیک اور لالی پیکٹ کے نزدیک ہو رہے تھے۔۔۔ تھوڑی دیر بعد لاقب او جھل ہو گیا اور ہم ایک ویران اور بے آباد وسعت میں آ گئے جہاں اکا دکا جھاڑیاں تھیں اور زمین میں دبے ہوئے پتھروں کی سختی تھی جو نظر آتی تھی۔۔۔ اور یہیں پر ایک ٹکڑا خیمہ نما پتھر تھا۔۔۔ خاصا بلند اور آس پاس کی تقریباً ہموار لینڈ سکیپ میں انتہائی نمایاں جیسے اسے کسی خاص منصوبے کے تحت وہاں رکھا گیا ہو۔۔۔ دور سے وہ ایک ایسے خیمے کی طرح نظر آتا تھا جو پتھر کا تھا۔

”یہ قبرستان ہے۔“ سلطان نے اشارہ کیا اور خود وہیں رک گیا جہاں تھا۔ پتھر کا سامنے کا حصہ صاف تھا اور یوں لگتا تھا جیسے زمین میں ایک بہت بڑا کتبہ

گاڑ دیا گیا ہو۔ اس پتھر کے آگے خشک لکڑیاں تھیں۔ پھوٹے پتھروں کے دو تین بے ترتیب مجموعے تھے اور ان میں دو تین سل نما پتھر نمایاں تھے۔ ان پر جاپانی زبان میں اوپر سے نیچے کچھ تحریر تھا۔ کیا تحریر تھا؟ یہ صرف وہ جانتے تھے جن کے جاننے والے ان کے نیچے دفن تھے۔ اس بڑے کتبے کے سائے میں ان کو پھاؤں کی قبریں تھیں جو ٹانگا پریت کو زیر کرنے آئے تھے لیکن خود زیر زمین ہو گئے۔ اس زمین نے انہیں زیر کر لیا۔

یہاں ہوا تیز چلتی تھی۔

اور دور دور تک کوئی ذی روح نہ تھا۔ صرف ٹانگا پریت کی برقیں اس سارے منظر پر حاوی تھیں۔۔۔

ہم ان کے قریب بیٹھے رہے۔ یہ کہاں کے تھے اور کہاں دفن ہیں۔ ٹیڑھے میڑھے سوکھے ہوئے درخت اور ان میں پتھروں کے ڈھیر اور ان پر جاپانی زبان کے حروف۔۔۔ شاید یہ لکڑیاں اور سوکھی جھاڑیاں اس لئے رکھی گئی تھیں کہ موسیٰ ادھر نہ آئیں۔۔۔

جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے روپل پیک کی برف تک نگاہ جاتی تھی اور راستے میں پست قد درخت تھے۔ دائیں ہاتھ پر اس مختصر قبرستان کا مشرکہ کتبہ تھا جو ازل سے یہاں شاید اسی لئے تھا کہ ادھر وہ آئیں گے اور دفن ہوں گے تو ان کے نام یہاں لکھے جائیں گے۔ میں نے قریب جا کر ان ناموں کو دیکھا جو ان کے ساتھیوں نے پتھر کے چرے پر کھرچے ہوئے تھے۔

AUSTRIA

WASTLARNOLD

1939 -- 1976

PETER FUORRE

1982

S. IIDA

N. YAMADA

Y. TAKAMORI

1983.7.12

JAPAN

ان میں سے آرٹھ کی موت کو میں نے زیادہ محسوس کیا کیونکہ وہ بھی ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوا تھا اور اسے مرے ہوئے تیرہ برس ہو چکے تھے۔ آخر میں جاپانی آئے تھے چھ برس پہنچے۔ یہ تو درست ہے کہ یہ کہاں کے تھے اور کہاں دفن ہیں لیکن اس پہاڑ کے نیچے دفن ہیں جسے زیر کرنے وہ گھر سے نکلے تھے۔ اگر یہ آسٹریا اور جاپان کے کسی قبرستان میں دفن ہوتے تو کون جانتا کہ یہ نانگا پریت گئے تھے۔

تھائی۔ ویرانی اور تیز ہوا اور ہم سے ذرا الگ سلطان ایک چتر کو سر کے نیچے رکھے آرام کرتا ہوا۔ لیکن وہ ہمیں بھی دیکھتا تھا۔ ہم وہاں بہت دیر تک چپ بیٹھے رہے۔ ہوا کے اس دھمکے شور میں جو نانگا پریت سے اتر کر سیدھا اس کتبے تک آرہا تھا اور یہ کتبہ اس کا راستہ روک رہا تھا۔

سلطان اٹھ کر ہمارے پاس آگیا "چلیں صاحب؟ یہ جگہ اچھی نہیں ہے۔ کافروں کی قبریں ہیں۔"

"تم ان کے لئے دعا نہیں کرتا" راہی نے پوچھا۔

"ہاں۔" سلطان نے تیوری چڑھا کر سر ہلایا "کافر ہے۔"

"جس جاپانی کے ماں باپ آئے تھے اسے کہاں جلایا تھا؟"

"ادھر۔۔۔" سلطان نے پست قدم درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھا "ادھر کوئی نہیں جاتا۔"

"چلیں؟"

"ہاں بابا۔۔۔ ادھر ہڈی ہو گا۔"

میرے یہ ماحول زیادہ اثر انداز ہوا تھا اور وہ خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ چتر پر کھڑے ہوئے نام پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اور ویسے بھی جدھر جاپانی کو جلایا تھا اور ادھر اس قبرستان میں جاپانی آتا ہے۔" سلطان نے اوپر نانگا پریت کے اس حصے کی طرف دیکھا جہاں یکپ ٹو لگتا ہے۔

"کونسا جاپانی آتا ہے۔" راہی قریب آگیا اور اس کی جیکٹ کا کالر تیز ہوا سے پھینکا رہا تھا۔ "جو لیم کے ساتھ آتا ہے؟"

"ہاں۔" سلطان نے سر ہلایا "ادھر اس میدان میں اوپر نانگا پریت کے اس راستے سے جاپانی بھاگتے ہوئے آتے ہیں ادھر۔"

راہی فکر مند ہو گیا "جاپانی بھاگتے ہوئے آتے ہیں؟ سلطان یہ جاپانی جو بھاگتے ہوئے آتے ہیں تو یہ پہلے اوپر جاتے ہیں اور پھر وہاں بھاگتے ہوئے آتے ہیں ناں؟"

"ہاں صاحب یہ مرے ہوئے جاپانی ہوتے ہیں جو وہاں سے آتے ہیں۔۔۔ اور۔۔۔" سلطان ابھی فقرہ مکمل نہیں کر پایا تھا کہ راہی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جلدی سے کہا "اوہو سلطان ادھر موسم بہت اچھا ہے۔ اور تمہارے کتے بچے ہیں۔ گائے بھی ہے؟"

سلطان ذرا پریشان ہو گیا۔ "میں تو جاپانی۔"

"کوئی جاپانی شاہی نہیں۔" راہی نے فوراً کہا۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ اس ماحول نے جہاں مجھ پر گمراہ کر دیا تھا وہاں راہی کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور وہ ہرگز ہرگز اس دیرانے میں نانگا پریت کی ہوا کے شور اور تھائی میں مرے ہوئے جاپانیوں کا قصہ نہیں سننا چاہتا تھا۔

"ہاں تو سلطان تم مجھے بتاؤ کہ جاپانی کدھر سے آتے ہیں؟" میں اس روایت کو جاننا چاہتا تھا۔

"صاحب وہ ادھر سے نانگا پریت پر سے اترتے ہیں اور بھاگتے ہوئے اس میدان میں آتے ہیں اور پھر اوپر چلے جاتے ہیں۔"

"باپ رے۔" راہی نے یکدم شور مچا دیا اور پھر بلند آواز میں کوئی ہنگامی گانا گانے لگا۔ کہ اے دریا تیرا کنارہ نہیں۔۔۔

"اور یہ مرے ہوئے جاپانی ہوتے ہیں! ہو سکتا ہے وہی ہوں جو یہاں دفن ہیں؟"

"خدا معلوم۔ لیکن صاحب وہ بہت بے چین ہوتے ہیں۔"

"اور کس وقت آتے ہیں؟ دن کو یا رات کو؟"

"دن کو بھی آتے ہیں صاحب۔ لیکن پورا چاند ہو اور بادل نہ ہوں۔"

"تارڑ صاحب۔" راہی نے دھپ سے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا "ادھر سے چلو۔"

"نہرس ابو۔۔۔" میرے پاس آیا اس کے ہاتھ میں تین چار کاسنی رنگ کے پھول تھے "یہاں پھول بہت کم ہیں۔" وہ جھکا اور ایک پتھر پر برش اور سیاہی کی مدد سے لکھے گئے جاپانی حروف پر پھول رکھ دیئے۔

لاٹو واپسی پر میں جب بھی مڑ کر اس پتھر لے کتبے کو دیکھتا تو وہ تین چار کاسنی پھول مجھے اس لئے نظر آ جاتے کہ ان کے پس منظر میں روپل پیک کی برف تھی۔ سوکھی ہوئی لکڑیاں تھیں اور پتھر پر جاپانی حرف تھے۔۔۔

”ٹاپ میدان کی رات میں الاؤ اور اس کے سائے نازگاہ پر بت پر“

راہی ہم سب سے آگے چل رہا تھا۔ لاٹو گاؤں کے قریب پہنچ کر میں اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر ان جہازی سائز پتھروں پر چڑھتا ہوا بلندی کی طرف جانے لگا جن پر لاٹو کے جمونہڑے بنے ہوئے تھے۔ میں نے ایک دو غار نما کمرے بھی دیکھے اور ان میں وہ آنکھیں بھی دیکھیں جو مجھے چھپ کر دیکھتی تھیں۔۔۔ راہی اور سمیر مزید کوہ پناہی کے موڈ میں نہیں تھے اور میں لاٹو کی بلندی پر پہنچ کر میدان اور سات ندی کی تصویر اتارنا چاہتا تھا۔۔۔

جتنی دیر میں میں لاٹو کے سب سے بلند پتھر پر بنی ہوئی چھوٹی سی مسجد تک پہنچا اتنی دیر میں سمیر راہی اور سلطان میدان عبور کر کے خیمے تک پہنچ رہے تھے۔ اور میں انہیں یہاں ہے ان کی چال سے پہچان رہا تھا۔ سمیر ایک ہرن اور اونٹ کی ملی جلی چال چلتا تھا۔۔۔ راہی ایک غیر محسوس طریقے سے حرکت کرتا جاتا تھا اور سلطان ایک ٹھہراؤ سے آگے بڑھتا تھا۔۔۔ تصویر اتار کر میں نیچے آیا تو گاؤں کے سامنے ندی کے کنارے چند لوگ آہستہ پالٹی مارے بیٹھے تھے۔ اور ان میں ایک غیر ملکی جوڑا بھی تھا۔۔۔ یہاں پر ہمارے جمیل اور سکول ٹیچر محمد الماطون سے بھی ملاقات ہوئی۔ گھاس پر دو نیلے رک سیک اونڈھے پڑے تھے۔ اور یہ فرانس سے آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ جنگلوں سے پیدل چلتے آرہے ہیں۔ یعنی بوئگی۔ استور۔ گریگوٹ اور ترشک سے ہوتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔۔۔

”آج آپ کہاں سے آئے ہیں؟ روپل سے؟“

”نہیں۔“ انگریزی چونکہ صرف لڑکی جانتی تھی اس لئے اس نے جواب دیا ”ہم ادھر ٹاپ میدان کے دوسری جانب سینگ کے بیس کیپ سے آئے ہیں“

”جلیانوں کا کیا حال ہے؟“

”ایک لڑکی زخمی ہے۔ شاید آج یا کل پہلی کاپڑا سے نکالنے کے لئے آئے۔ ہم نے تو سنا تھا کہ سینگ بیس کیپ اور ٹاپ میدان کے درمیان جو گیشیر پڑتا ہے وہ نرم پڑ گیا ہے اور اس پر سے گزرنے والے ہلکے سے گزرتے ہیں۔“

”ہوں۔“ لڑکی نے سر ہلایا اور پھر اپنے ساتھی کو فراہمیں میں کچھ کہا جس پر اس نے بھی ہونٹ سیکیڑ کر نہایت ڈراؤنی سی شکل بنائی ”ادھر سے کوئی نہیں آتا اور ہم اوپر سے روہل جا کر پھر ٹاپ میدان میں نہیں آنا چاہتے تھے اور ہم نے۔۔۔ اور یہ حماقت تھی ہم مرتے مرتے بچے

”لیکن وہاں سے گزرا جا سکتا ہے۔“ مجھ میں اس بیس کیپ تک جانے کی خواہش سر اٹھانے لگی۔

”ہاں۔۔۔ اگر تم اتنے ہی قوف ہو جاؤ جتنے ہم ہیں۔۔۔“ اس نے ہنس کر اپنے ساتھی کی جانب دیکھا۔۔۔ توڑی دیر بعد وہ اٹھے اور ماڈنوپاس کی جانب چلنے لگے۔ ان کے پاس ایک نقشہ تھا اور اس کے مطابق انہیں ماڈنوپاس کے آس پاس ایک ایسا راستہ ملنا تھا جو میدھاکیل جاتا تھا۔

جس طرح بغیر خوف کے اور غرور ہو کے یہ لوگ جنگوں اور پھاڑوں میں نکل جاتے ہیں یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ ہم اپنے ملک میں اپنے لوگوں میں ڈرے ڈرے پھرتے ہیں اور یہ حضرات ایک رک سیک اٹھا کر ایک نقشہ جیب میں ڈال کر گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

”آپ کے لئے میں لسی منگواتا ہوں۔۔۔“ محمد افلاطون نے ایک بچے کو بلا کر کچھ کہا۔

”اگر آپ یہ لسی ہماری کمپننگ میں بھیج دیں تو میرے ساتھی بھی پی لیں گے۔“ میں نے افلاطون سے کہا۔ اور یہ افلاطون بہت اچھا تھا۔ اور اس نے ہمیں مقامی رسوم و رواج سے آگاہ کیا۔ اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ مانگا پریت کی دایلوں میں ”لسی“ سے مراد گاڑھا دی ہوتا ہے اور یہ دی پیٹ کے لئے اور بلندی کی مٹی کے لئے تیر ہدف شے ہے۔ میں میدان عبور کر کے جب اپنے خیمے کے تقریباً سانسے پہنچا تو ایک حماقت کا احساس ہوا۔ میرے اور خیمے کے درمیان ندی تھی

اور میں سمیر کی طرح لم ڈھینگ اور چلیلا نہ تھا کہ اسے ذرا کوشش کر کے پھلانگ جاتا۔۔۔ لاقبوں گاؤں جا کر اسے عبور کرنا مجھے دشوار لگ رہا تھا کہ کون اتنی دور واپس جائے۔۔۔ میں اس کے کنارے کنارے چلنے لگا کہ شاید کوئی ایسا مقام ملے جہاں توڑی بہت جسمانی آد و فغاں سے نیا پار ہو جائے لیکن افسوس۔۔۔ مجھے سمیر نے اپنے پتھر پر بیٹھے ہوئے دیکھا اور ندی کنارے بھٹکتے ہوئے دیکھا اور وہ جان گیا کہ کیا معاملہ ہے۔ وہ بہت جلد میرے قریب پہنچ گیا۔ نیچے ندی کے دوسرے کنارے پر۔

”میرا ہاتھ پکڑ لیں ابو۔“ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا تو لگا کہ کوئی تیر مندر سے ہے جو مجھ تک چلا آتا ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر چھلانگ لگائی اور اس خدشے کے باوجود کہ اگلے لمحے میں ندی میں ہوں گا ندی کے پار جا کر۔ سلطان دوسرے کا کھانا تیار کر رہا تھا۔

راہی ایک درخت کی چھاؤں میں لاقبوں کے بچوں کے ایک غول میں بیٹھا ان کے کیچ بٹا رہا تھا۔ اور یہ فرمائشی کیچ تھے۔ ایک سوٹے سے تصویروں سے لدے بچے کو جب اس نے کیچ بنا کر دیا اور بچہ اسے لے کر جانے کو تھا تو راہی نے اسے روک لیا ”اوتے ٹھہرو اس پر میں نے اپنے دستخط تو کئے نہیں۔ کسی کو کیا پتہ لگے گا کہ یہ کس نے بنایا ہے۔“ اور پھر اس نے کیچ کے نیچے بڑے اہتمام سے ”راہی۔ لاقبوں“ تحریر کیا۔ اس کا معمول تھا کہ وہ لاقبوں کے بچوں کو جمع کر کے انہیں یوگا کی ورزشیں سکھاتا اور انہیں کہتا ”دیکھو تم کل آؤ تو منہ ہاتھ دھو کر آؤ پھر ہم تم کو بسکٹ دے گا۔ صابن نہیں ہے؟ نہیں تو ٹھیک ہے۔ رات کو چہرے پر مکھن لگا کر سو جاؤ۔ مکھن ہے ناں؟ اور پھر صبح اٹھ کر چکنی مٹی کے ساتھ منہ ہاتھ دھو لو تم خوبصورت ہو جاؤ گے۔“

اور یہ حقیقت ہے کہ راہی کی وجہ سے لاقبوں کے بچے باقاعدہ نکلنے لگے تھے۔ خوبصورت ہو گئے تھے۔ محمد افلاطون لسی کا ایک جگ اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ اور اس میں بے حد سفید اور گاڑھی دی تھی۔

اور اتنی طرح اس میں کوئی مکھی سٹچ پر یا زیر سٹچ نہیں تھی۔ میں نے اس میں دو گلاس پانی ڈالا اور چند چوچے چینی ملا کر خوب گھولا اور یہ ایک انتہائی شاندار مشروب بن چکا تھا۔ کھانے کے ساتھ میں اور سمیر لاہور کو یاد کرتے غٹ غٹ لیاں پیتے تھے۔ اور راہی روٹی پر جام لگا کر اس کا رول بنا کر اسے لٹا تھا اور کہتا تھا ”دیری گڈ فوڈ“

کھانے کے بعد محمود آگیا اور اس کے پاس اچھی خبریں نہیں تھیں۔
 ”دیو سائی کے لئے گھوڑا نہیں مل رہا صاحب۔ اس بوڑھے کے گھوڑے بھی
 جنگل سے واپس نہیں آئے۔ اور ادھر ٹاپ میدان اور لاقو میں اور کسی کے پاس
 گھوڑا نہیں ہے۔“

”تو پھر ہم ترشک کے راستے رحمان پور پل کے راستے چلم چوکی چلے جائیں گے
 اور وہاں سے پیدل دیو سائی۔“

”اس ٹینٹ کے ساتھ نہ جاؤ صاحب۔“ محمود نے سر ہلایا ”بڑا پانی بہت تیز
 ہوتا ہے اگر اس پر پل نہیں تو آپ پار نہیں جا سکتا۔ کیا کرے گا دیو سائی جا کر۔۔۔
 وہاں کیا ہے کچھ بھی نہیں۔“

”ہاں وہاں کیا ہے۔“ میں نے استغاثی بے بسی کے عالم میں ایک گمراہ اور ٹانگا
 پرست کی طرح سرد سانس لیا ”دفع کرو دیو سائی کو۔ دنیا میں چند سر پھرے لوگوں کے
 سوا کچھ نہیں ہے جو دیو سائی گیا ہے اور جو نہیں گئے۔ وہ بھی تو خوش و خرم ہیں اچھی بھلی
 زندگی گزارتے ہیں۔ دفع کرو دیو سائی کے روگ کو۔۔۔“

راہی اٹھ کر میرے پاس آگیا۔ وہ ہمدردی سے ہنسا ”مجھے معلوم ہے کہ
 دیو سائی آپ کے لئے کتنا اہمارت ہے لیکن۔۔۔ کیسے جائے گا۔ چھوڑو۔ دفع کرو۔“
 میں بہت دیر تک چپ بیٹھا رہا۔۔۔ میں ہر مرتبہ دیو سائی کے لئے گھر سے نکلتا تھا
 اور اسے دیکھے بغیر کچھ اور دیکھ کر واپس چلا جاتا تھا۔ شاید اسے قسمت کہتے تھے کہ
 یہ لکھا گیا کہ مجھے وہاں ابھی نہیں جانا۔

”صاحب آج رات بھی ادھر رہے گا؟“ سلطان میری طرف آ رہا تھا ”ادھر نہ
 چلیں ٹاپ میدان کی طرف۔۔۔ ادھر سے ہمارا بھک بھی نزدیک ہے اور نظارہ بہت ہے
 ۔۔۔“

”بالکل ٹاپ میدان۔۔۔ کوچ کرو سلطان“

آدھ گھنٹے کے اندر اندر ہمارا خیمہ پیک ہو چکا تھا اور بقیہ سالان رک سیک اور
 قیلوں میں ٹھونسا جا چکا تھا۔ محمد افلاطون نے پلاسٹک کین اٹھا لیا۔ ناظم اور ہمارے
 جیل بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اور لاقو کے بچے جو ہماری روانگی پر خوش نظر نہیں
 آتے تھے۔ یہ دیو سائی کی مایوسی تھی جسے بھولنے کے لئے ہم لاقو چھوڑ کر ٹاپ
 میدان کوچ کر رہے تھے۔

ہم سات ندی کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اس سے الگ ہونے سے پیشتر

میں نے جھک کر اس کا ٹھک پانی پیا۔

ہم درختوں کے ذخیرے میں تھے۔۔۔ پھر ایک تیز ٹانگا ٹانگا پرست سے اتر رہا تھا
 اور ہمارے راستے میں تھا۔ کیا ہم نے لاقو جاتے ہوئے اسے عبور کیا تھا؟ ضرور کیا
 ہو گا لیکن ہمیں یاد نہ تھا۔ اب ہم اس پہاڑی کی مخالف سمت میں آ نکلتے تھے جس
 کے پاؤں میں ہمارا خیمہ تھا اور جس کے اوپر سروٹ جمیل تھی۔ یہاں بڑے بڑے
 سفید پتھر تھے اور ان کے آس پاس دلدل نما علاقہ۔ یہ سفید پتھر ٹانگا پرست کی ایک
 چٹان کے عین نیچے تھے۔

”صاحب یہ شی گیری ہے۔۔۔ سب لوگ ادھر یکپ کرنا ہے۔۔۔“

میں نے ایک سفید پتھر پر بیٹھ کر شی گیری کا معائنہ کیا۔۔۔ ہوا سے محفوظ ٹاپ
 میدان کے ایک کونے میں الگ تھلک لیکن ٹانگا پرست کے بالکل نیچے۔۔۔ آپ یہاں
 سے سر اٹھا کر دیکھیں تو صرف بڑی چٹانیں نظر آتی ہیں اور ٹانگا پرست ان کے پیچھے رہ
 جاتی ہے۔ یوں بھی یہ گیلیا علاقہ تھا۔

”ادھر چلو جدھر تمہاری بھک ہے جدھر پہلے دن ہم پاک کے نمدے پر بیٹھ کر
 چائے پیتے تھے۔۔۔“

”ادھر ہوا بہت ہوگی صاحب۔۔۔“

”خیر ہے۔۔۔“

ہم ذرا آگے گئے تو ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں شوخ رنگوں کے دو رک سیک
 نظر آئے۔ تین پورٹر اسی پتھر پر سستا رہے تھے اور چٹان کے نیچے ایک استغاثی
 خوبصورت اور نواں گھوڑا خیمہ بسا ہوا تھا۔

”کون لوگ ہیں؟“ میں نے پورٹر سے دریافت کیا۔

”گورے ہیں۔۔۔“ انہوں نے اپنے تئیں مکمل معلومات دے دیں۔

اتنی دیر میں خیمے کا پردہ الگ ہوا اور اس میں سے نہایت صاف ستھرے لیکن
 تھکے ہوئے اور ذرا بیزار میاں بیوی باہر آئے۔ ہمیں دیکھ کر وہ زبردستی مسکرائے۔

”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“ میرے آگے بڑھ کر پوچھا۔

”اطالیہ۔۔۔ ہم نے لازمو پاس جانا تھا لیکن پچھلے دو دن سے استور روڈ بند تھی
 اس لئے اب ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔۔۔ ہم یہیں سے واپس چلے جائیں گے اور
 ہم تین برس سے اس ٹریک کی تیاری کر رہے تھے۔“ ان کی بیزار سی سمجھ میں آتی
 تھی۔

”لیکن اتنی دور آ کر واپس چلے جانا تو بہت دل توڑنے والی بات ہے۔“
 ”ہماری چھٹی ختم ہونے والی ہے اور ہم دیر سے کام پر نہیں پہنچ سکتے۔“
 انہوں نے ہم سے مقامی قسم کی کچھ معلومات حاصل کیں اور پھر اپنے خیمے میں گھس کر پردے کی زپ بند کر دی۔ ہمیں پور نہ کیجئے اور اپنا راستہ لیجئے اور ہم نے اپنا راستہ لیا۔

ٹاپ ٹی سن یا روپل دریا کے اوپر رکھے ہوئے درختوں کے تنوں پر سے اس مرتبہ ہم بے خطر گذرے۔ اور دوسری جانب چلے گئے۔ اب ٹاپ میدان ہمارے سامنے وسیع ہو رہا تھا۔ چدر چدر اہوں کے گھر تھے ذرا بلندی پر اس ڈھلوان میں نئی بہت تھی اور گھاس کے نیچے پانی تھا اس لئے ہم درختوں کے ذخیرے کے اختتام پر رک گئے اور وہیں خیمہ نصب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں زمین سخت گھاس اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں پتھر تھے اور ان کے علاوہ درختوں کے سوکھے ہوئے تنے بے شمار تھے اور کسی تجردی پینٹنگ کی طرح ایک شاندار پس منظر میں دکھائی دیتے تھے۔ بائیں جانب یہاں سے بھی روپل بیک نظر آتی تھی۔ سامنے ذرا خلیب میں دریائے روپل پھیلا ہوا تھا۔ تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی چرگا دکھائی دیتی تھی اور اس کے ساتھ روپل گیشیز کا اونچا کنارہ دکھائی دیتا تھا کنارہ یا دیوار کہہ لیجئے جسے مقامی زبان میں ٹاپ نہیں کہتے تھے اور کچھ لوگ اسی گیشیز کو جسے پار کر کے سرنگ ہیں کہتے ہیں ”کم کھ“ کا نام دیتے ہیں۔ اس دیوار کے ساتھ جو پاڑی اٹھتی ہے اور نانگا پربت کے تھوڑے سے حصے کو چھپاتی ہے اس کا نام میل ہے۔ اور میل سے اوپر کھل کی چرگا ہے۔ اور دائیں جانب پہاڑوں کا وہ سلسلہ تھا جس کے اندر سے ہم برآمد ہوئے تھے اور ہمارے سامنے ٹاپ میدان پھیلا ہوا تھا۔ چدر اہوں کی بہکوں کے پیچھے بلندی پر برف تھی۔

اور ادھر ہوا واقعی بہت تھی اور بہت تیز تھی۔ اتنے وسیع میدان میں جب وہ نانگا پربت سے نیچے آتی تھی تو بلا روک ٹوک چلتی تھی اور تیز ہوتی چلی جاتی تھی۔ ہمارے خیمے کا کپڑا اس کے بوجھ سے سلسل دیتا چلا جاتا تھا۔
 ”ہم شام کو آئیں گے۔“ ہمارے مقامی دوست خیمہ نصب کرنے کے بعد چلے گئے۔ صرف چند ہیچے رہ گئے جو لاتو کے تھے اور جو نزدیکی پتھر پر بیٹھے آپس میں

چلیں کرتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی رخصت ہو گئے۔
 راجی پتہ نہیں کہاں تھا شاید دریا کی جانب گیا تھا۔
 سلطان اور محمود بہک کی طرف جا چکے تھے اور انہوں نے روٹی اور آلو لے کر شام کو لوٹا تھا۔

خیمے کے اندر پچھلے پیر کے سورج کی زردی بہت شوخ اور آنکھوں کے اندر تک جاتی تھی۔ میر چٹانی ٹوپی پہنے اپنے سر کے نیچے ہاتھ رکھے سیدنگ بیک پر لیٹا خیمے کو تنکا جا رہا تھا۔ صبح سے اس کی صحت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ وہ کچھ چپ تھا اور کچھ اس کی آنکھوں میں سرخی بہت تھی۔ یہاں خیمے کے نیچے اس کا سفید رنگ دکھتا تھا اور وہ چپ چاپ اپنی آنکھیں جھپکاتا خیمے کے روشن کپڑے کو دیکھ رہا تھا۔
 ٹاپ میدان میں دریا بہتا تھا اور بننے کی ہلکی آواز تھی اور اس کے ساتھ ہوا کی سرسراہٹ بلند ہوتی تھی۔ میں بھی کچھ ست محسوس کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ خیمے کے اندر ایک پرسکون ٹھنڈا تھا جیسے اپنے گھر میں ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اوگھ گیا۔

میری آنکھ کھلی تو خیمہ بدستور زرد روشنی کی زد میں تھا اور میر آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا۔ مجھ میں خند اور کسل مندی اور تھوڑی سردی تھی۔ کچھ دیر میں نے دریا اور ہوا کے ہلکے شور کو ٹاپ میدان کی تنہائی میں سنا اور پھر اٹھ بیٹھا۔ میں نے دیکھا کہ میر جاگ رہا ہے اور اس کی آنکھیں مزید سرخ ہیں۔ میں نے اس کے گالوں اور ماتھے کو چھوا ”کیا بات ہے بیٹے؟“

”کچھ نہیں ابو۔“ اس نے بالکل کوری اور خالی آواز میں کہا۔

”بخار تو نہیں۔ تمہارا وجود کچھ گرم ہے۔“

”نہیں بس وہی تھوڑا سا زکام ہے جو ہو جایا کرتا ہے۔“

”آؤ ذرا دریا تک چلتے ہیں۔ نانگا پربت بالکل صاف دکھائی دے رہی ہے۔“

”نہیں ابو۔“ وہ کھوٹ بدل کر لیٹ گیا۔

خیمے سے باہر۔ اس کے ارد گرد۔ دور دور تک۔ درختوں اور جھاڑیوں میں۔ ڈھلوانوں پر اور چرگاہوں میں کوئی نہ تھا۔ موٹی بھی نہ تھی۔ جیسے گذریے ٹاپ میدان کو خالی کر کے چلے گئے ہوں۔ ان کے جمونپڑے سرسبز ڈھلوانوں کے ساتھ لگے دکھائی نہ دیتے تھے۔ میں نے سوچا کہ زرد خیمے اور اس کے پس منظر میں

ٹانگا پریت کی ایک تصویر اتاری جائے اور اس متعہ کے لئے میں خیمے سے بہت کر بہت دور تک گیا، چتا رہا لیکن۔۔۔ یہ ممکن نہ تھا کہ خیمے کے ساتھ ٹانگا پریت چوٹی تک ایک تصویر میں سا جاتی۔۔۔ ڈھلوان کے ساتھ زمین گیلی تھی اور یہاں دیکھ کر چلتا پڑتا تھا۔ کہیں کہیں چھوٹی ٹالیاں بھی چل رہی تھیں۔۔۔ اور پھر آگے جا کر تھوڑی سی رست نظر آئی۔۔۔ یہاں دریا کی ایک چھوٹی سی شاخ بہتی تھی اور اس کے پار جانا آسان تھا کہ اس میں مناسب وقتوں سے پتھر ابھرے ہوئے تھے، یوں بھی مجھے پار جانا تھا کیونکہ میں نے وہاں سے غاصے فاصلے پر راہی کو سپاٹ کر لیا تھا۔۔۔ دریا کی اس شاخ سے پرے پانی کی وسیع گزرگاہ تھی۔۔۔ پتھر اور کنکر اور کہیں کہیں رست۔۔۔ دریا کا مرکزی دھارا کہیں درمیان میں بہتا تھا لیکن چھوٹی چھوٹی شاخیں پورے میدان میں ہموار چلتی تھیں۔۔۔ اور پھر قریب آ کر ایک بدن ہو کر روپل گیشیز کے نیچے چلی جاتی تھیں۔۔۔ وہی روپل گیشیز جس کے اوپر ہم نے کیمپ کیا تھا۔۔۔

دریا اتنا ہموار تھا کہ یک رنگ کنکروں کے درمیان جہاں وہ بہتا تھا نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے پار جو چراگاہ تھی اس میں دھبوں کی صورت میں چند موٹی نظر آئے۔۔۔ وہ مجھ سے بہت دور تھے، ہمیں سے رینگ ہیں کیمپ کو راستہ جانا تھا۔۔۔ راہی دریا کے دھارے کے قریب کھڑا تھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی اور وہ سر اٹھا کر ٹانگا پریت کو انتہائی محویت سے دیکھ رہا تھا۔۔۔ میں قریب ہوا۔۔۔ لیکن اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا نہیں حالانکہ اس نے جان لیا تھا کہ میں وہاں ہوں۔ وہ اسی طرح پورے منظر کو تیز ہوا میں دیکھتا جا رہا تھا۔۔۔ وہ دیکھتا رہا۔۔۔

اور میں بھی ٹاپ میدان کے اس وسیع منظر میں گم کھڑا رہا۔ کسی اور دنیا میں۔۔۔ کتنے الگ اور کتنے مختلف۔ کیا ہم وہی ہیں، لاہور اور اسلام آباد کی چالاکی اور منافقت اور ریاکاری کے نمائندے۔۔۔ پھنے خال۔۔۔ تکبر اور جھوٹ کے بیوپاری۔۔۔ معاشرے کی جعلی اخلاقیات کو تقویت دینے والے۔۔۔ اور جب ہمارے اندر شور ہوتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے، یہ جھوٹ ہے تو ہم اس کے سامنے یہ جج ہے جج ہے کا لاؤڈ سپیکر لگا دیتے ہیں۔ کیا ہم وہی ہیں۔ یا ہم آہستہ آہستہ بدل چکے ہیں۔ کچھ بونجی کے باہر کی وسیع لینڈ سکیپ میں۔ کچھ جیب کے سامنے پرواز کرتے ہوئے چکوروں سے۔ کچھ ترشک کی سرد ہوا میں۔ کچھ روپل کے گل رنگوں میں اور بہت کچھ

یہاں۔۔۔ ٹاپ میدان میں۔۔۔ اور اگر ہم نہیں بدلے تو یقیناً ہمارے دلوں پر قفل پڑ چکے ہیں۔

میں راہی کے قریب ہوا تو اس نے ٹانگا پریت سے نگاہیں ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ وہ مسکراہٹ عجیب اور ناقابل بیان تھی جو اس کے چہرے پر تھی۔ اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور مجھے محسوس ہوا کہ اس آبی پردے پر ٹاپ میدان کی وسعت اور ٹانگا پریت کی بلندی نقش ہے۔ اور شاید اسی لئے وہ آنکھیں نہیں جھپکاتا کہ کہیں یہ تصویر ہم نہ جائے۔۔۔ میں پھر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نکل ہوا تھا۔

”تارڑ بھائی۔۔۔“ اس نے صرف اتنا کہا۔

”کیا ہو رہا ہے راہی چاچا۔۔۔“ میں نے ذرا خوش دلی سے پوچھا۔

”میں ادھر تھا۔۔۔“ اس نے ٹانگا پریت کی طرف اشارہ کیا ”اور پھر دریا کے۔“

کنارے اس میدان میں کھڑا اور ادھر ہوا تیز تھا۔ تو میں اس کو تنہیک ہو کر رہا تھا۔ شکر یہ بولا کہ تم نے مجھے یہ سب کچھ ان آنکھوں سے دکھایا۔ اور پھر مجھے اتنی بہت دی، اتنی محبت دی کہ میں یہاں پہنچ گیا۔ ان دونوں چیزوں کا شکریہ کہا۔ ”وہ پھر مجھ سے الگ ہو گیا اور اوپر دیکھنے لگا۔“

میں دریا کی گزرگاہ میں چلتا اپنے خیمے تک واپس آ گیا۔ خیمے کا پردہ گرا ہوا تھا۔ دھوپ ڈھل رہی تھی۔ میں نے جھک کر پردہ اٹھایا تو سیر اسی طرح لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور آنکھیں سرخی میں تھیں اور وہ چپ تھا۔

”کیا بات ہے بیٹے؟“

”کچھ نہیں ابو۔“ اس نے منہ پرے کر لیا۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا سر اپنے بازو پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے اس کے بالوں کو سنوارنے لگا۔ ”کیا بات ہے سیم۔ اہی یاد آ رہی ہیں؟“

”نہیں۔۔۔“ اس کی آواز مدہم تھی۔

”بھائی جان اور بھئی یاد آ رہے ہیں۔“

”نہیں ابو۔۔۔“

”تو پھر کیا ہے بیٹے؟“

اور پھر میرے اس بازو پر جس پر اس کا چہرہ آرام کرتا تھا۔ ایک نیم کرم

گیلاہٹ پھیل گئی۔۔۔ پہلے ایک آنسو۔ اور میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا صرف اپنے ہاتھ پر محسوس کر سکتا تھا اور پھر ٹپ ٹپ تین چار آنسو۔ اور وہ میرے بازو سے پھسل کر کہنی تک چلے آئے۔ میں بالکل بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اور پھر میں نے اس کا چہرہ اپنی جانب کئے بغیر اپنی انگلیوں سے اس کی جھکتی ہوئی آنکھیں تلاش کیں اور ان پر ہاتھ پھیرا۔۔۔ "اواس ہو گئے ہو بیٹے؟"

"نہیں ابو۔۔۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا "یہ ٹاپ میدان بہت دور ہے۔۔۔ میں تڑپک پنچوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا، کم از کم وہاں جیپ تو آتی ہے۔۔۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

یہ گھر سے دوری کا احساس تھا۔۔۔ یہ گھر سے مکمل طور پر کٹ جانے کا احساس تھا۔۔۔

میں نے سوچا ہم اگلی صبح واپسی کے لئے خیرہ سیٹ لیں گے۔

ٹاپ میدان کی وسعت ان چند چروں میں سمٹ آئی جو خیرہ کے قریب ایک بہت بڑے لاؤ کے قریب تھے اور ان پر آگ کی پرچائیاں حرکت کرتی تھیں۔ بہادر جمیل درختوں کے سوکھے ہوئے تنوں کو دونوں ہاتھوں سے گرفت میں لیتا اور انہیں ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ زمین میں سے نکال باہر کرتا۔۔۔

یہ تپتے ہوئے تھے اور ان میں سے پچھلے پختے کی بارشوں کی نمی بھی خشک ہو چکی تھی۔۔۔ وہ لاؤ پر تھوڑی دیر تک بے پروائی سے پڑے رہتے اور پھر یکدم جل اٹھتے۔۔۔

سلطان بک سے ایک تازہ روٹی اور ابلے ہوئے آلو لے کر آیا تھا۔۔۔ تازہ روٹی کو میں نے اور سمیر نے ہنہو اور سارڈین مچھلی کے ساتھ کھایا اور مشروب کے طور پر سیون اپ کے ٹین کھولے۔۔۔ آج ٹاپ میدان میں ہماری آخری شب تھی اس لئے ہم جشن کے موڈ میں تھے۔۔۔ ابلے ہوئے آلو راہی کے لئے تھے۔۔۔

"نہ نہ۔۔۔" راہی یکدم اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس وقت بہادر جمیل خیرہ کے سامنے ایستادہ دو ٹنڈ منڈ تنوں میں سے ایک پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا "اس تپتے کو نہ اکھاڑو۔ دیکھتے نہیں خیرہ کے ساتھ ان دونوں سوکھے ہوئے درختوں کی کمپوزیشن بنتا ہے۔ بابا کمپوزیشن خراب نہ کرو۔"

بہادر جمیل نے راہی کی طرف منہ کھول کر دیکھا کہ اسے کیا اعتراض ہے اور پھر اس نے اندازہ لگایا کہ اسے جو بھی اعتراض ہے اس کی سمجھ سے باہر ہے اور وہ بس یہی چاہتا ہے کہ اس درخت کو نہ اکھاڑا جائے۔ اس نے اس تپتے کو چھوڑ کر دوسرے تپتے پر ہاتھ ڈال دیا۔۔۔

"نہ بابا۔۔۔ دونوں کمپوزیشن ہیں۔ کوئی اور درخت لے آؤ"

بہادر جمیل ٹھٹھے میں نیچے اترا اور دریا کے قریب زمین پر گرے ہوئے ایک بہت بڑے تپتے کو گھسیٹا ہوا لے آیا۔ "یہ ٹھیک ہے؟"

"ہاں شاہاش۔۔۔" راہی نے سر ہلایا اور پھر منسوب ہو کر اپنے آلو کھانے لگا۔۔۔ میں اپنے کافی کے مک پر جھک گیا۔ دریا اور ہوا کے ساتھ اب آگ کی آواز بھی تھی۔ اور اس کی گرمی جو نمی سرد بدن کو چھوتی سرد ہوا اسے سیٹھ کر لے جاتی۔۔۔

"سٹر پلیٹ۔" راہی محمد افلاطون کو اسی نام سے پکارتا تھا "آپ ٹیچر ہیں تو کدھر پڑھاتے ہیں؟"

"ہم ادھر پڑھاتے ہیں۔۔۔" افلاطون نے پاؤں کی طرف اشارہ کر کے کوئی عجیب سا نام لیا۔۔۔

"تو ادھر اس علاقے کا کیا پر اہم ہے؟"

"ادھر جناب بے روزگاری بہت ہے۔۔۔ اسے دور کرنے کے لئے سکول بننا چاہئے۔۔۔ ادھر ہائی سکول صرف استور اور گریگوت میں ہے۔ اور پورے شمالی علاقے میں تین کالج ہیں۔ سکرو، ٹنگت اور چلاس۔ آپ واپس جا کر ادھر بول دینا کہ ادھر ہائی سکول بنا دے۔۔۔"

"اچھا بول دے گا" راہی نے سر ہلایا اور پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو وہ اٹھ کر میرے پاس آگیا "ٹارڈ صاحب آپ کو الہی کی دوا چاہئے۔۔۔ نہیں چاہئے؟ اگر ضرورت ہو تو میرے پاس ہے الہی کی دوا۔۔۔"

"راہی صاحب میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ مجھے الہی کی دوا نہیں چاہئے۔ الہی ہو تو دوا مانگوں۔۔۔"

"آپ نے تو میرا دل توڑ دیا۔۔۔ میں خاص طور پر اپنے ساتھ الہی کی دوا لے کر آیا ہوں۔ اور آپ لیتے ہی نہیں۔۔۔" وہ مسکراتا ہوا اپنی جگہ پر واپس چلا گیا۔

میں اپنی ڈائری کھول کر ٹاپ میدان کے بارے میں تفصیلات جمع کر رہا تھا کہ اس پہاڑی علاقے کا کیا نام ہے اور اس گیشیز کو کیا کہتے ہیں جب میں نے سر اٹھا کر سلطان سے کہا "سلطان کیا تم نے خود لاٹویو کے قریب جاپانیوں کو ٹانگا پریت سے اتر کر قبرستان والے میدان میں دوڑتے اور پھر واپس جاتے دیکھا ہے؟"

"ہاں ہاں۔۔۔" وہ پورے یقین سے بولا۔ "اگر پورا چاند ہو تو وہ آتے ہیں نا۔۔۔"

"ارے ارے۔۔۔ سلطان۔۔۔" رائی نے بڑی سنجیدگی سے اسے ڈانٹا "نہیں نہیں آپ انہیں نہیں سناؤ۔"

"نہیں سناؤں گا صاحب۔۔۔" وہ چپ ہو گیا۔

"دیے آج چاند کی کیا تاریخ ہے؟" رائی نے مجھ سے پوچھا اور اس وقت ہم سب نے پہلی بار آسمان کی طرف دیکھا اور وہاں چاند تھا۔۔۔ مینے کی پہلی راتوں کا بجھا بجھا چاند جیسے تھا ہوا ہو۔ لیکن اس میں اتنی روشنی تھی کہ اگر ہمارا لاؤ روشن نہ ہوتا تو ٹاپ میدان اور ٹانگا پریت جگے جگے نظر آتے۔۔۔

"شاید آج چاند کی آٹھویں یا نویں ہے۔"

"پھر ٹھیک ہے وہ سالا جاپانی ابھی چودہ تاریخ تک ٹانگا پریت پر ہی بیٹھا رہے گا نیچے نہیں آئے گا۔۔۔" رائی نے تسلی سے ہاتھ ملے۔ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آ سکی کہ رائی ٹانگا پریت سے اترنے والے جاپانیوں کی کہانی سے کیوں اتنا خوفزدہ ہوتا تھا۔۔۔

"دیے صاحب ادھر اس قسم کی کہانی تو بہت ہے۔۔۔ پری اور چڑیل وغیرہ کی۔۔۔" بہادر جمیل کہنے لگا۔

"سناؤ۔۔۔" سمیر نے شرارت سے رائی کی طرف دیکھا۔

"نہیں نہیں کوئی نہیں سناؤ۔" رائی نے شور مچایا۔ "رات کے وقت بالکل نہیں سناؤ"

"ایک کہانی تو یہ جو لڑکا تھا ہمارے ساتھ ناظم۔۔۔ اس کے دادا کے بارے میں ہے۔۔۔" محمد افلاطون بتانے لگا "کیوں بہادر جمیل ناظم کا دادا تھا ناں۔۔۔"

"ہاں جی۔۔۔ اور کہانی بالکل سچی ہے۔"

"ناظم کا دادا اس علاقے کا بہت بڑا شکاری تھا۔ اس کے پاس نو شکاری کتے تھے جن کی مدد سے وہ ریچھ کو بھی مار ڈالتا تھا۔ وہ چورت میں رہتا تھا۔ ایک مرتبہ ادھر ٹاپ میدان کی طرف شکار کرنے آیا اور مارخور مارے لیکن شام سے پہلے گھر نہیں پہنچ سکا اس لئے ادھر ہی رات گزارنا پڑا۔ اس نے ہماری طرح ایسے لکڑیاں جلائیں اور بیٹھ گیا۔۔۔ ابھی جلائیں تو روٹی آگئی۔۔۔"

"کیا آگئی؟" اب رائی بھی دلچسپی لینے لگا۔

"روٹی۔۔۔ یعنی چڑیل۔"

"اُدھ باپ رے۔۔۔" رائی نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کی اور سمیر کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔

"تو یہ روٹی اس کی بیوی کی شکل میں اس کے پاس آئی اور کہنے لگی 'تم ادھر بیٹھے ہو گھر کیوں نہیں آتے؟ لیکن ناظم کا دادا پہچان گیا کہ یہ اس کی بیوی نہیں ہے بلکہ روٹی ہے کیونکہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے پاؤں پیچھے کی طرف ہیں یعنی وہ پھیل چکی ہے۔ چنانچہ اس نے کہا تم گوشت کھاؤ گی؟ روٹی نے کہا ہاں کھاؤں گی۔ ناظم کے دادا نے مارخور کی ایک ٹانگہ آگ میں ڈال کر بھونی اور پھر جب روٹی اسے نکالنے لگی تو اس نے اسے بالوں سے پکڑ لیا اور مارخور کی ٹانگہ کے ساتھ بہت مارا۔۔۔ اتنا مارا کہ روٹی کہنے لگی 'مجھے مت مارو میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں گی۔ ہاں ناظم کے دادا نے ایک چالاک یہ کہ اس نے روٹی کے بالوں میں ایک گانٹھ دے دی۔ اس طرح وہ کہیں نہیں جاسکتی تھی۔ پھر اس نے شکار کا تمام گوشت روٹی کے اوپر لاوا جس طرح گدھے کے اوپر لاتے ہیں کیونکہ ایک روٹی پانچ گدھوں کے برابر بوجھ اٹھا سکتی ہے۔۔۔"

ہم سب آگ کے قریب ہونے لگے۔ ٹاپ میدان کی اس بڑی تنہائی میں اور اس رات میں یہ کہانی ہمیں اپنے بہت نزدیک لگ رہی تھی۔

"۔۔۔ ناظم کے دادا نے روٹی کے ساتھ شادی کر لی اور دو سال بعد اس کے ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ جب بیٹی ذرا بڑی ہوئی تو ایک روز بیٹی اور روٹی مونٹی لے کر گاؤں سے باہر گئے۔ وہاں روٹی نے کہا بیٹی ذرا میرے بال تو دیکھ لو۔۔۔ بیٹی نے بال دیکھ کر کہا 'اماں ان میں تو گانٹھ ہے۔ اور اس نے روٹی کے بالوں میں گھٹی گانٹھ کھول دی۔ اس کے کھلتے ہی روٹی کی شکل بدل گئی۔۔۔"

”اوہو۔۔۔ شکل بدل گئی۔ کیسے بدل گئی۔ کمانی ختم ہو گئی۔“ راہی نے پوچھا۔

”بس جی شکل بدل کر چلیں جیسی ہو گئی اور پھر وہ پرواز کر گئی۔ لیکن جانے سے پہلے اس نے کہا کہ میری طرف سے کلفتنگ کو کہہ دو کہ وہ زبان میں بہت تیز ہوں گے اور جب وہ سو ہو جائیں گے تو پھر ان کے ہاں اولاد نہیں ہوگی۔ کلفتنگ بشوم ایک جگہ کا نام بھی ہے چورت کے پاس جہاں ناظم کا دادا شکار کے لئے جاتا تھا۔ اور آج بھی ان کی نسل کی زبان بہت تیز ہے۔ کیونکہ روٹی نے یہ کہا تھا۔“

بجھا ہوا چاند آہستہ آہستہ نانکا پریت کے پیچھے ہو رہا تھا۔ ستارے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ پھر چاند مکمل طور پر نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن اس کی ہلکی روشنائی سے نانکا پریت کا ایک حصہ زیادہ واضح دکھائی دینے لگا۔ دریا کے بڑھتے ہوئے شور سے لگتا تھا کہ اس کے پانی قریب آ رہے ہیں۔ لیکن یہ خاموشی تھی جو آوازوں کو بلند کرتی تھی اور قریب لاتی تھی۔

ایک الاؤ ہم نے فیئری میڈو کی رات میں روشن کیا تھا۔ اسی پہاڑ کے دوسری جانب۔ لیکن تب ہم اس کے اتنے قریب نہ تھے کہ الاؤ کی پرچھائیاں برف پر لرزتی دکھائی دیتیں۔ ہم یہ الاؤ کیوں روشن کرتے ہیں؟

شاید ہمیں اس اندھیرے سے الجھن ہوتی ہے جو ہماری جانب بڑھتا ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ! تیز ہوا شراروں کو اڑاتی تھی اور وہ عارضی جگہوں کی طرح فضا میں بلند ہو کر بجھ جاتے تھے۔

”گھروٹنے والے مویشی“

چرواہوں کے جھوپڑے جو ڈھلان پر تھے ابھی سورج کی آنکھ سے پوشیدہ تھے اسی لئے سائے میں تھے اور ان میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

دھوپ ٹاپ میدان میں ابھی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔

دریا کے پانی پر جہاں کہیں کرنیں پڑتی تھیں وہ زمین سے الگ دکھائی دیتا تھا۔ میں اس کی درجنوں چھوٹی چھوٹی شاخیں پھاٹک کر یا ان میں پڑے پتھروں پر چل کر ٹاپ میدان کے درمیان تک پہنچ گیا تھا اور یہاں دریا کا بڑا دھارا ایک دھبے شور کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اپنے چہرے کو اس کے تازہ پانیوں کے ساتھ دھویا اور ان کی خشکی نے میرے ماس کو سرد کیا اور میں زیادہ دیکھنے لگا۔

صبح کے اس لمحے ٹاپ میدان کے عظیم پھیلاؤ میں صرف میں تھا۔ نانکا پریت صاف آسمانوں میں بلند ہوتی تھی۔ اور پھر میرے سامنے بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس کے کسی گلیشیر میں سے اٹھ کر اس کی چوٹی کے گرد لپٹا اور وہیں ٹھہر گیا۔

سیاہ زوہ اور دوسرے مویشی جھوپڑوں سے بیٹھے آئے لگے۔

میں نیچے کو واپس آیا تو ہمارا سالان پیک ہو چکا تھا اور ایک پر سرت میر نیچے کے دروازے پر بیٹھا ہوا اپنے جوگرز کے قسے بانٹ رہا تھا۔ قریب ہی ایک گدھا لالعلقی سے گھاس چر رہا تھا۔

”صاحب۔۔۔ ایک گدھا ابھی کم ہے۔۔۔“

”تو کدھر گیا؟“

”یہ وہ چالاک گدھا ہے جسے ہم بانٹہ کر رکھتے ہیں۔ اب وہ جنگل میں چھپ گیا ہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آج بوجھ اٹھانا ہے۔“

”یار سلطان گدھے کو کیسے معلوم ہو گیا کہ آج ہی بوجھ اٹھانا ہے؟“

”معلوم ہے میں صاحب گدھا پر قوف نہیں ہوتا بہت سمجھ والا ہوتا ہے۔۔۔۔۔“
محمود کا والد اس کے پیچھے گیا ہے وہ اسے لے کر آئے گا۔۔۔۔۔“
پچھلی شب محمود نے ہمیں بتایا تھا کہ اس کا والد واپسی پر ہمارے ساتھ جائے گا
کیونکہ اسے ترشک سے پیغام آیا تھا کہ ادھر اس کے لئے ایک ٹیم کا بندوبست ہو گیا
ہے۔۔۔۔۔

پینک مکمل ہو گئی، ناشتہ کر لیا گیا اور پھر ہم جنگل میں چھپے ہوئے گدھے کا
انتظار کرنے لگے۔ اور چونکہ یونہی منہ بند کر کے انتظار کرنا بہت دشوار ہوتا ہے اس
لئے ہم نے سلطان سے کہا کہ وہ بے کار نہ بیٹھے اور پیکٹ سے چکن کارن سوپ تیار
کرے۔۔۔۔۔ چنانچہ ہم گرم چکن کارن سوپ کی پیمکیوں کے ساتھ جنگل میں چھپے ہوئے
گدھے کا انتظار کرنے لگے۔
چکن کارن سوپ ختم ہوا تو مجھے انڈوں کی پوٹلی کا خیال آگیا۔۔۔۔۔ ”سلطان۔۔۔۔۔“
ہمارے انڈے۔۔۔۔۔

سلطان نے اپنی جیکٹ کی جیب کو تھپکا ”ادھر ہے۔۔۔۔۔“ لیکن صرف وہ رہ گیا
ہے۔۔۔۔۔“
”یاد رکھنا آج شام ہم ان کا آلیٹ بنا کر کھائیں گے۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے؟“
”ٹھیک ہے صاحب۔۔۔۔۔“

ہم ان انڈوں کو ہر جگہ اٹھائے پھرتے تھے لیکن جہاں کہیں کیپ کرتے انہیں
نوش کرنا بھول جاتے اور یہ کم ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے سلطان کو ایک بار پھر
تاکید کی کہ سلطان آج شام۔۔۔۔۔
”مارڈ صاحب آپ کو الرجی کی دوائی چاہئے۔۔۔۔۔“ رائی نے بڑے درد بھرے
لہجے میں پوچھا۔

”جی نہیں۔۔۔۔۔“
”میں تو خاص طور پر اسلام آباد سے لایا تھا۔۔۔۔۔ اگر آپ کو ضرورت پڑے تو
بلا تکلف مانگ لیجئے گا۔“

دریا سے پرے، سبیل پہاڑی کے پیچھے سے جہاں سینگ ہیں کیپ تھا ایک
کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور میدان میں پھیلی اور پھر ایک بڑا سارا چھتر نمودار ہوا۔۔۔۔۔
سلطان نے آنکھوں کے سامنے چھبایا کر ادھر دیکھا۔۔۔۔۔ ہم سے کئی کلومیٹر کے
فاصلے پر گلیشیر کی دیوار کے پیچھے سے ایک ہیلی کاپٹر ابھر رہا تھا۔ وہ نانگا پربت کی وسیع

دنیا کے پس منظر میں بہت ہی منفی اور نامعلوم سا لگ رہا تھا لیکن اس کی آواز اس
کے وجود سے کئی گنا بڑھ کر میدان پر پھیلی تھی۔۔۔۔۔
”یہ اس جاپانی لیڈی کو لینے آیا تھا جس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔۔۔۔۔“ ہیلی کاپٹر
گلیشیر کی دیوار کے اوپر اڑتا ہوا روپل کی جانب چلا گیا۔

”گدھا آگیا صاحب۔۔۔۔۔“ سلطان نے دھلوان کی جانب اشارہ کیا۔
یہ گدھا اتنی دور سے سلطان کو جانے کیسے دکھائی دے گیا کیونکہ ہم نے اسے
صرف اس وقت دیکھا جب وہ دریا کے کنارے تک آگیا۔ گدھے کے ہمراہ محمود کا
والد تھا۔ ایک مضبوط جسم کا پستہ قد مشقتی بوڑھا جو ہر بات منہ کھول کر سنتا تھا۔
ہماری زبان سے بالکل بلاواقف تھا اور وہ ہمیشہ لافعلی سے ہر شے کو غور سے دیکھتا رہتا
جیسے کسی نے زبردستی اس کی ڈیوٹی لگا دی ہے کہ ان چیزوں کو دیکھتے رہو اور وہ اس
ڈیوٹی سے تنگ آ چکا تھا۔ اس کی واحد خوشی نسوار کی ایک ڈبیہ تھی جیسی وہ نکال کر
حسب عادت بہت دیر تک دیکھتا رہتا اور پھر ایک چنگی بھر کر گلے تلے دباتا اور ایک
سرخوشی کے عالم میں چلا جاتا۔۔۔۔۔ میں نے اس کے ساتھ سفر کے دوران محسوس کیا کہ
وہ اپنے گدھے کی رفاقت میں ہی خوش رہتا ہے۔۔۔۔۔
”صاحب آپ روانہ ہو جائیں۔“ سلطان کہنے لگا ”ہم سلمان لے کر آتے ہیں۔“

ہم تینوں چلنے لگے کیونکہ اب ہم راستہ جانتے تھے۔ میرا ایک ایسے اڑیال کی
طرح پلا مٹکس بھرتا ہوا چلنے لگا جس کا مالک اسے تھوڑی دیر کے لئے بھجے سے باہر
نکالتا ہے۔ اس کا پورا وجود مکمل خوشی تھا۔
رائی نے میری جانب دیکھا ”گھور کھو گائے۔۔۔۔۔“
”رائی چاچا کیا کہتے ہو۔۔۔۔۔ بنگالی میں کچھ کہتے ہو؟“
”ہاں۔۔۔۔۔ بنگال میں کہتے ہیں کہ گھور کھو گائے۔۔۔۔۔ گھر کو لوٹنے والا موٹی بیٹھ
خوش ہوتا ہے۔۔۔۔۔ میر کو دیکھو۔“

ہاں۔۔۔۔۔ میر کو لوٹنے والا موٹی تھا۔
آج شام ہم نے روپل میں کیپ کرنا تھا۔ پہلے سینگ ہیں کیپ جانے کا
پروگرام بنا لیکن اس صورت میں روپل مس ہوتا تھا اور ہم روپل کو مس نہیں کرنا
چاہتے تھے۔ نانگا پربت کی چوٹی کے پاس کوئی چھوٹی سی کبھی نما چڑ حرکت کرتی تھی۔
ہم تینوں کھڑے ہو گئے۔ یہ کیا ہو سکتا ہے؟ پھر احساس ہوا کہ یہ ٹھگت سے اسلام

آباد جانے والا تو کر جنازہ ہے۔ لیکن یہ اوہر ہے دریائے سندھ کے اوپر فیئر میڈو کی جانب۔

ہم ڈھلوان عبور کر کے وہاں تک آئے جہاں سے پھر شروع ہو جاتے تھے۔ میر آگے آگے جا رہا تھا اور میں اسے بار بار روکتا۔ لیکن وہ اس وقت گھور گھو گائے تھا۔ جس مقام پر دریائے روہل ٹاپ میدان کی وسعت ملے کرنے کے بعد روہل گلیشیر کے نیچے جاتا تھا وہاں ہم تھوڑی دیر کے لئے رکے یہاں پہاڑ کی ڈھلوان اتنی شدید تھی کہ میں نے اپنی چھڑی زمین پر رکھی تو وہ دو میٹر تک لڑھکتی گئی۔ نیچے روہل گلیشیر کے سفید اور سیاہ ہاتھی درختوں ہاتھی ہاتھی جوڑے زور لگا رہے تھے اور ان کے نوٹے گرنے اور دریا میں لڑھکنے کی خوفناک آوازیں ہمیں ایک مرتبہ پھر دہشت زدہ کرتی تھیں۔ جب ہمارے گدھے اور پورٹر ہم تک پہنچ گئے تو پھر ہم کی صورت میں سفر شروع ہو گیا۔

وہ مقام آیا جہاں ہم نے قیام کیا تھا۔ میری ڈائری کا پھنا ہوا ورق پتھروں میں اٹکا ہوا تھا۔ ہمارے الاؤ کے نشان وہاں ایسے تھے جیسے ہم ابھی اٹھ کر گئے ہوں۔ اور ہم ابھی اٹھ کر گئے تھے کیونکہ ٹاپ میدان اور لاٹو ابھی سے کم ہو رہے تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے ہم وہاں تھے۔ ٹانگا پریت کے گرد آج پاول تھے اور اس کا تھوڑا سا حصہ نظر آتا تھا۔ نیچے میں یکپ میں چوٹی کے سین نیچے دھند ٹھہری ہوئی تھی۔

ہم وہاں رکے اور سلطان اوپر سے پانی لے کر آیا۔ اوپر کسی چٹان کے اندر بیٹھے پانی کا ایک چشمہ تھا۔ ایک ہاتھ میں پانی کا کین اور دوسرے میں گلابی رنگ کے پھولوں کا ایک گچھا۔

”یہ ٹوپی پر لگاؤ میر صاحب۔“ میر اکثر گرم پٹانی ٹوپی پہنتا تھا اور گورے چنے رنگ روپ کی بنا پر یہ ٹوپی اس پر جتنی بھی بست تھی۔ بلکہ دور سے بعض اوقات وہ ترشک کا کوئی کسان بچہ لگتا۔

”تم لگا دو“ اس نے ٹوپی سلطان کو دے دی۔ اور سلطان نے بڑے اہتمام سے وہ پھول ٹوپی کے ایک جانب اڑس دیے ”نہیں دنوں کہتے ہیں ان پھولوں کو۔ اور جو لڑکا یہ پھول لگائے اس کی شادی جلد ہو جاتا ہے“

شوکر سے ذرا آگے ایک تنگ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے میں نے نیچے دیکھا۔ وہی روہل گلیشیر اور دریا کا شور اور چٹانوں میں سے لگتے ہوئے چند پھول۔

”ان پھولوں کا نام کیا ہے سلطان؟“

”بتاتا ہوں۔۔۔ میں لانا ہوں آپ کے لئے“ اس نے پانی کا کین پگڈنڈی پر رکھا اور یکدم نیچے اترنے لگا۔ اسے ہم نیچے اترنا تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ ڈھلوان اتنی تیز اور بھرپور تھی کہ اس نے پگڈنڈی سے پاؤں نیچے رکھا تو نیچے سے مٹی نکل گئی اور وہ ایک ایسی کار کی طرح آگے ہونے لگا جس کی مکمل بریک لگ چکی ہو اور وہ اپنی پہلی رفتار کے زور سے خواہ خواہ آگے جا رہی ہو۔ میرا تو دم رک گیا، سلطان کیا کر رہا ہے۔ وہ سیدھا نیچے گلیشیر میں جا سکتا تھا۔ لیکن وہ ان پھولوں کے قریب جا کر رکا اور انہیں سمیٹ کر پھر اوپر آنے لگا۔ اور اوپر بھی وہ اس طرح آیا کہ ایک قدم اوپر اور دو قدم نیچے خواہ خواہ۔ ”صاحب یہ پھول چرکی کہلاتا ہے۔ اسے سردرد کے لئے سوگھتے ہیں۔ آپ سوگھو۔“

پھر ہم چڑ کے جنگل میں آ گئے۔ برج کے ٹیڑھے میڑھے سفید درخت اوپر ڈھلوانوں پر تھے سنو لائن کی قربت میں۔ یہاں سے ہم نیچے اترے۔ دریائے روہل کا مخدوش پل عبور کیا اور اس جگہ پر جا کر رکے جہاں ہم دوپہر کے کھانے کے لئے ٹھہرے تھے۔ چڑ کے بلند درختوں کے سائے میں، ایک بہت بڑی کھوہ۔ دو چٹانوں پر جمعت کی طرح رکھی ایک چٹان۔ ہم نے وہاں آرام کیا، دوپہر کا کھانا کھایا۔ اور کچھ دیر اس خیال میں رہے کہ یہ جگہ شب بھری کے لئے کتنی پرسکون اور مناسب ہے لیکن پھر ہمیں داویء روہل کے سورنگ یاد آئے اور ہم نے ان کی طرف کوچ کیا۔ اس جگہ کو مقامی باشندے پچاٹ کہتے ہیں۔ یہاں سے ایک بلندی سامنے آتی ہے جس پر ایک کپا راستہ ہے اور وہ راستہ جب اوپر جا کر ختم ہوتا ہے تو اوپر روہل سامنے آ جاتا ہے۔

اوپر روہل کے گہرا سی طرح ویران تھے۔ اسی طرح اجڑے ہوئے تھے۔ ہم ان سے پرے ہو کر کھیتوں میں چلے گئے۔ دور ہراوہل میں ایک گلابی رنگ کا ٹکڑا ہوا میں پھنپھرتا تھا اور پھر کھیتوں پر ڈھیر ہو جاتا تھا۔ یہ ہم بہت دیر سے اور بہت دور سے دیکھ رہے تھے اور جب ہم نزدیک ہوتے گئے اور جب اس کے پاس آ گئے تو دیکھا کہ یہ تین پورٹر ہیں، تین غیر ملکی سیاح ہیں اور یہ چھ حضرات ایک خیمے کے کپڑے کو اٹھائے ہوئے ہیں اور اسے کھیت کے درمیان میں لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور یہ کوشش پچھلے نصف گھنٹے سے جاری تھی کم از کم۔ کیونکہ ہم نصف گھنٹے سے ان کی طرف بڑھ رہے تھے اور دیکھتے دیکھتے گلابی کپڑا ہوا میں پرندے کی طرح اٹھتا ہے اور

پھر ڈیر ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک پورٹر اپنا محمود تھا۔۔۔ وہ خیمہ چھوڑ کر ہماری طرف آگیا۔

”صاحب آپ ذرا اس ٹینٹ کو دیکھو۔۔۔ یہ ہم سے لگ نہیں رہا“
 وادی روپل سائے میں آ رہی تھی اور سائے کی وجہ سے اس کے کھیتوں کی ہیرا دل زیادہ گہری ہو رہی تھی۔ اپر روپل ویران پڑا تھا اور لوئر روپل یہاں سے ابھی دور تھا اور ہمیں وہاں جانا تھا۔۔۔ اور کھیتوں کی گہری ہیرا دل پر گلابی خیمہ سمٹا ہوا پڑا تھا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے ایک سٹنک اور دانشور قسم کے سیاح سے دریافت کیا۔

”دنیا مسائل سے بھری پڑی ہے۔ کم از کم ہم تینوں کی دنیا۔۔۔ ہم سوئٹزر لینڈ سے آئے ہیں اور گلٹ پہنچ کر ہم نے یہ خیمہ جی ایم بیگ سے کرائے پر حاصل کر لیا۔۔۔ آج دوپہر ترشک پہنچے اور وہاں رکے بغیر سفر شروع کر دیا۔ ہم مائنو پاس جا رہے ہیں۔۔۔ آہ“ اس نے مایوسی سے سر جھٹکا ”پہلے تو ہم مائنو پاس جا رہے تھے اب پتہ نہیں کہاں جا رہے ہیں۔۔۔ کیونکہ یہاں پہنچ کر یہ خیمہ کھولا ہے اور لگانے کی کوشش کی ہے تو لگتا نہیں ہے۔۔۔ میرا خیال ہے یہ مکمل نہیں ہے۔“

دوسرا سیاح جو نوجوان تھا کھیتوں میں محو کر پھول جمع کر رہا تھا وہ ہمارے پاس آگیا ”اگر یہ خیمہ نہیں لگ سکتا تو ہم مائنو پاس نہیں جا سکتے۔۔۔ آج کی رات تو ہم کسی جھونپڑے میں گزار لیں گے لیکن یہاں سے آگے کیا ہو گا۔۔۔ میرا خیال ہے کہ ہماری سالانہ چھٹیوں کا بیڑہ غرق ہو چکا ہے اور ہم مائنو کو بھول کر واپس سوئٹزر لینڈ چلے جائیں۔“

بقیہ دو پورٹرز اور ایک سیاح اس دوران خیمے کے کپڑے اور رسیوں اور راڈ کے ساتھ الجھتے رہے کہ کسی طرح سلجھے اور کھڑا ہو جائے۔ لیکن وہ کھڑا نہ ہوتا تھا بلکہ فوراً ڈھل جاتا تھا۔۔۔ ویسے یہ والا خیمہ تھوڑا پیچیدہ بھی تھا۔

میں نے گلٹ واپسی پر جب بیگ صاحب سے ان کے خیمے کی ناموری کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگے ”میں نے انہیں زور دے کر کہا تھا کہ پہلے اس خیمے کو کھول کر زمین پر لگا لو پھر ساتھ ملے جانا لیکن وہ کہتے تھے کہ ہم جلدی میں ہیں اور یوں بھی سوس لوگ خیموں کے بارے میں پاکستانیوں سے زیادہ جانتے ہیں۔“

دانشور سیاح نے ہمارے گدھوں کے قریب جا کر ہمارے سامان کا معائنہ کیا اور پھر میرے پاس آ کر کہنے لگا ”تمہارے پاس بھی تو خیمہ ہے؟“

”ہاں ہے۔۔۔“
 ”اور ظاہر ہے کہ یہ کھڑا ہو جاتا ہے۔۔۔“
 ”سو فیصد۔۔۔“

”اور اب تم ٹانگا پریت سے واپس جا رہے ہو! ٹھیک ہے؟ تو تمہیں اس کی ضرورت نہیں۔۔۔ ہم اس کو خریدنے کے لئے تیار ہیں۔ قیمت تم بتا دو۔“
 ”ہم آج رات وادی و روپل میں اور۔۔۔۔۔ اس خیمے میں گزارنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔“

”وہ رات ہمیں گزار لو۔۔۔ دیکھو اگر ہمارے پاس خیمہ نہیں تو ہم آگے مائنو تک نہیں جا سکتے اور ہمیں یہیں سے واپس گلٹ جانا پڑے گا کیونکہ گلٹ سے اوھر تو کسی خیمے کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ قیمت تم بتا دو“
 محمود بھی کہنے لگا کہ صاحب ذرا تیز چل کر شام تک ترشک پہنچ جائے۔ اور خیمے کو فروخت کر دو۔۔۔ جو قیمت مانگو گے یہ ہنس کر دیں گے۔۔۔

لیکن میرے لئے روپل میں شب بھری کاروبار سے زیادہ اہم تھی۔۔۔ ہم نے مناسب الفاظ میں معذرت کی اور اپنے گدھے ہانکتے ہوئے پھر چلنے لگے۔۔۔ میں جب بھی مڑ کر دیکھتا گلابی خیمہ سرسبز کھیتوں میں پھنپھرتا ہوا اور گرنا ہوا نظر آتا۔
 ہوا چلنے لگی اور کبھی کبھی ایک آدھ بوند بھی گرنے لگی۔

نوجوان ذرا ہنسا ”بند کر کے کیا کرتا ہے۔ وہ کھلا ہے۔“
 ”سلطان خان۔۔۔ سلمان واپس گدھوں پر۔۔۔ ہم سکول کے قریب خیمہ لگائیں
 گئے۔“

سلطان نے میرا فیصلہ ناپسند کیا ”ادھر ان کو شام کی روٹی کا کما ہے تو اب چلے
 جائیں تو اچھا نہیں ہے۔۔۔“

”تم روٹی یہاں لے کر آ جانا۔۔۔ سلمان گدھوں پر“
 سکول کی عمارت راستے سے ذرا ہٹ کر تھی۔ میں نے پر آمدے میں جا کر ایک
 دروازے کو دھکیلا تو وہ فوراً کھل گیا۔ ایک بڑا کمرہ، دو کھڑکیاں، کھڑکیوں میں شیشے
 لگے ہوئے۔ فرش لکڑی کا جس پر بکریوں کی سسکتیں اور چارہ بکھرا ہوا اور جناب ایک
 شاندار چمٹ۔ شام قریب ہو، ہوا تیز ہو اور سرد ہوا ہو اور بارش کا امکان ہو تو ناگہا
 پریت کی دادی روپل میں رات گزارنے کے لئے ایک آوارہ گرد کو اور کیا چاہئے۔
 ایک نہیں تین آوارہ گردوں کو۔۔۔

”یہ اچھا ہے صاحب۔۔۔“ سلطان کا موڈ بھی ٹھیک ہو گیا ”میں اس کو اور اچھا
 کرتا ہوں“ اس نے چند شیشیاں جوڑ کر ایک جھاڑو بنایا اور اس کمرے کو صاف کرنے
 لگا۔

بابا محمود نے گدھے ان پیک کئے اور پھر نسوار کی چٹلی منہ میں رکھ کر ایک
 پر امن مسکراہٹ کے ساتھ ہم سے الگ ہو گیا۔
 لکڑی کا فرش صاف ہوا تو اس پر خیمے کا کپڑا بچھا کر سیلنگ بیک کھول دیئے
 گئے۔ کچھ سلمان کھڑکیوں میں رکھ دیا گیا اور یوں ہم روپل میں بے فکر اور آرام سے
 ہوئے اور بڑے اطمینان سے ہوئے۔

کمرے کی ایک کھڑکی پچھلی جانب کھلتی تھی۔ اس کے دو فریم شیشے سے خالی تھے
 اور باہر کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ ان دو فریموں میں الگ الگ شاید اس وقت
 کی۔۔۔ خوبصورت ترین تصویریں فریم میں جڑی ہوئی تھیں۔ ایک فریم میں گلابی
 پھولوں کا ایک پورا کھیت تھا اور دوسرے فریم میں ایک راستہ تھا جس کے دونوں
 طرف پھول تھے۔ یہ دو تصویریں۔۔۔ زندہ تصویریں ہمارے کمرے کی زیبائش تھیں۔
 دیواروں پر بچوں نے۔۔۔ دنیا کے تمام بچوں کی طرح چیزیاں اور طوطے بنائے تھے لیکن
 ان کے علاوہ انہوں نے اپنے خیالات کی ترجمانی بھی کی تھی۔ دیواروں پر جو فقرے
 کوئلے سے لکھے گئے تھے وہ کچھ یوں تھے۔

”دادی روپل دیکھنے والے آوارہ گرد کی مسکراہٹ میں فرق ہوتا ہے“

لوہ روپل تک پہنچتے پہنچتے ہوا بھی تیز ہوئی اور سرد بدترس بھی۔
 میں اپنے آس پاس کو اس نظر سے دیکھتا جا رہا تھا کہ یہاں کس جگہ پر آسانی
 سے خیمہ لگ سکتا ہے۔ ایک چھوٹے سے خوبصورت جاپانی طرز کے قدرتی باغ کو
 دیکھ کر میں رک گیا ”سلطان یہاں؟“
 ”نہیں صاحب ادھر قریب پانی نہیں ہے“
 ہم پھر چلے گئے۔

دائیں ہاتھ پر ایک لکڑی کے گھر کے ساتھ سرسبز دھوان تھی اور تین درخت
 تھے جو ہوا کے زور سے جھولتے تھے۔ درختوں کے نیچے جگہ ہموار تھی۔ ”یہاں ٹھیک
 ہے صاحب۔۔۔ بارش سے بچاؤ بھی ہوگا“ سلطان گھر کے اندر جا کر اس کسان خاندان
 سے اجازت لے آیا تھا اور ان سے رات کے کھانے کے لئے روٹی کا سوال بھی دراز
 کیا تھا۔

بابا اپنے گدھے سے سلمان اتارنے لگا۔

روپل کے چند لوگ ہمارے گرد جمع ہو گئے ”یہاں سردی ہوگی باہر۔۔۔“
 اور مجھے رہ رہ کر اپنے باریک خیمے کا خیال آنے لگا۔ وہ بارش کو نہیں روک
 سکتا تھا۔ اگر رات کو بارش تیز ہو گئی تو۔۔۔ ہوا میں بھی خاصی خشکی تھی۔
 ”یہاں کہیں سکول نہیں ہے۔۔۔“ میں نے ایک نوجوان لڑکے سے پوچھا۔
 ”ادھر آگے ہے۔۔۔ پر ان دنوں چھنیاں ہیں اور وہ بند ہے۔“
 ”اگر وہ بند ہے تو اس کے تالے کی چابی کس کے پاس ہوتی ہے؟“

"ہیلو... ذرا ادھر آؤ"

وہ جھپٹکا ہوا آگیا۔ اس کے کانوں پر مختصر سا سامان تھا۔ بال لمبے تھے جن کی اس نے پٹیا بنا کر لٹکا رکھی تھی۔ وہ ایک خوش شکل جاپانی تھا۔
"ہیلو۔" اس نے قریب آ کر کہا اور سر ہلا کر مسکرائے لگا "تم یہاں رہتے ہو؟"

"نہیں... روپل میں یہ میری پہلی شام ہے۔ تم کہاں گھوم رہے ہو؟"
"میں تڑھک سے آ رہا ہوں اور... شام ہونے کو ہے۔ رات گزارنے کے لئے کوئی محفوظ جگہ تلاش کر رہا ہوں۔"
"ادھر آؤ۔" میں نے اسے اشارہ کیا "ادھر۔"

وہ جھپٹکا ہوا برآمدے میں آگیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کو کہا۔ "کیا خیال ہے کیا یہ رات گزارنے کے لئے محفوظ جگہ ہے کہ نہیں؟"
وہ مسکرائے لگا لیکن اسے یقین نہیں آیا۔ ایک بے آسرا آوارہ گرد کو جب کسی اجنبی وادی میں شام ہو جائے اور اسے ایک جائے پناہ مل جائے تو اسے فوراً یقین کبھی نہیں آتا۔
"کیا میں یہاں رات گزار سکتا ہوں؟"

"آپ ہمارے مہمان ہیں۔"

وہ کوزی تھا۔ ایک جاپانی شاگ برادر جو ہر برس اپنا قہری بیس سوٹ اتار ایک ڈھیلی پتلون اور جیکٹ پہنتا تھا۔ اپنی ڈی گس کار اور خاندان اور جاپان کو چھوڑتا تھا اور قراقرم یا ہمالیہ کی وادیوں میں آوارہ ہو جاتا تھا۔ وہ انگریزی آسانی سے اور بے باکی سے بولتا تھا۔

اس نے ہمارے کمرے میں کھلتے ایک اور دروازے کے اندر جھانکا۔ یہ سکول کا دوسرا کمرہ تھا۔ "اگر میں اس کی صفائی کر لوں تو کیا میں اس میں رات گزار سکتا ہوں۔"
"کیوں نہیں۔"

تھوڑی دیر میں کوزی اس کمرے کو رہائش کے قابل بنا کر اس میں کوزی ہو چکا تھا۔

کھانا تیار ہو چکا تھا۔

"کوزی کیا تم کچھ کھانا پسند کرو گے؟"

یہ ایک گندا سکول ہے
یہ ایک چھوٹا سکول ہے
مجھے یہ سکول پسند نہیں۔ سکول فضول ہے
اس سے بہتر میرا گھر ہے۔

بچوں نے بطور خاص ایک جیب اور ایک بس کی تصویر بنائی تھی۔ شاید یہ ان کی خواہش تھی کہ ان کی وادی تک یہ دونوں چیزیں آجائیں۔

سکول کے برآمدے میں روپل کے چند بچوں کے درمیان راہ بیٹھا تھا اور ان کے کچھ بنا رہا تھا۔ سمیر پھولوں بھرے کھیتوں میں ایک خصوصی مشن کے لئے گیا ہوا تھا۔

سکول کے سامنے وہ راستہ تھا جو اپر روپل سے آ رہا تھا اور تڑھک کو جا رہا تھا۔ تڑھک گلشیر کی دیوار یہاں سے قریب تھی۔

سلطان نے حسب معمول چولہا گرم کیا اور دال چاول تیار کرنے لگا۔ اس دوران میں نے ایک مقامی باشندے سے پانچ انڈے اور تھوڑا سا مکھن خریدا تاکہ دال سے پیچھا چھڑا کر آلیٹ چاول کا ڈز کیا جائے۔

ہم محفوظ تھے۔ اور شاید اسی لئے بارش کا خدشہ بھی ختم ہو گیا اور جو ہوندا باندی جاری تھی وہ بھی رک گئی۔

اس شام روپل سکول کے برآمدے میں بڑی رونق تھی۔ دو گدھے جو پھول چر رہے تھے۔ سلطان کا دھواں دیتا ہوا چولہا۔ راہی کی مصوری۔ روپل کے بچے۔ اور ان سب کے آس پاس ایک ایسی وادی جس میں سورنگ تھے اور سب کے سب شغف تھے اور کھیتوں میں ابھی ابھی ان کی بارش ہو کر رکی تھی۔

تڑھک جانے والے راستے کے ساتھ ساتھ پانی بھی چلتا تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس راستے پر ابھی شام گہری نہیں ہوئی اور ایک غیر ملکی سیاح چلا آ رہا ہے اور اس کی چال میں روانی نہیں ہے جیسے وہ رکنا چاہتا ہے، ٹھہرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک مقامی بچہ تھا جو منہ اٹھائے اس کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ اور میں جان گیا کہ وہ ایک آوارہ گرد ہے اور رات سر پر ہے اور وہ ایک چھت تلاش کر رہا ہے۔

"ہیلو..." میں نے اسے ہاتھ بلایا "کہاں سے آئے ہو؟"

وہ وہیں رک گیا "جاپان" اس نے جواب دیا اور پھر چلنے لگا۔

”نہیں شکریہ۔۔۔ میں نے شام کے کھانے کا بندوبست کر رکھا ہے۔“ اس نے
نہیں کے ایک ڈبے میں سے دو نامکمل بسکٹ نکالے ”میرے پاس جوس کا ایک پیکٹ
بھی ہے۔۔۔“
”تم ان بسکٹوں اور جوس کو کسی مشکل وقت کے لئے بچا رکھو اور آج کی شام
ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔“

کوڑی کے سامنے جب نوڈل سوپ آیا تو اس کے چہرے پر ایک بے چارگی سی
پھیلی ”یہ آپ میرے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔۔۔ نوڈل سوپ میرا پسندیدہ ہے۔۔۔ یہاں
ہالیوے کی ایک وادی میں نوڈل سوپ۔۔۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“

کھانے کے بعد کافی کے لئے ہم برآمدے میں آ بیٹھے۔۔۔ اندر کڑی کے فرش پر
دو موم بتیاں روشن تھیں۔ دروازہ کھلا تھا۔ بجلی سی روشنی برآمدے تک آتی تھی۔
لیکن اس سے پرے سب کچھ اندھیرے میں گم تھا۔ ایک سرد بسکٹ تھا۔ ہاں ایک
گہری اور گھٹی منک تھی جو کھیتوں کے سبزے اور جنگلی پھولوں کی نیم خوابیدگی سے
اٹھ رہی تھی۔۔۔ انسانوں کی طرح اکثر پودے رات کے وقت آرام کرتے ہیں۔ ان
کے پتے اور پھول نرم پڑ جاتے ہیں اور اس نیم خوابیدگی میں ایک منک ہوتی ہے۔

جیسے کسی کارواں سرائے میں رات بسر کرنے والے مسافر کھانے کے بعد الاؤ
کے گرد بیٹھ کر اپنے سفر کی راحتوں اور صعوبتوں کے قصے چھیڑ دیتے ہیں۔۔۔ ایسے ہی
ہم روپل سکول کے برآمدے میں بیٹھے اور سرد سکوت میں بیٹھے اور پودوں، پتوں اور
پھولوں کی نیم خوابیدگی سے اٹھنے والی منک میں سانس لیتے ایک دوسرے کے سفری
تجربے سنتے رہے۔

”کھیتوں میں کبھی کبھار ایک سرسراہٹ سی چلتی تھی۔۔۔ ہوا کا کوئی گوشہ جھونکا
۔۔۔ جو ہمارے بدنوں کو چھوتا تھا تو ہم اپنے آپ میں سنتے تھے۔“

اندھیرا مزید گہرا ہو گیا کیونکہ ایک موم بتی مکمل ہو کر فرش پر پھیل کر بجھنے
لگی۔۔۔

دوسری موم بتی کے بجھنے کے بعد ہم ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر باتیں نہیں
کرتے تھے کیونکہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے اس لئے اپنے آپ سے
باتیں کرتے تھے۔۔۔

ہم نے سوچا کہ سکول کے پیچھے جو راستہ ان گھروں کو جا رہا ہے جو پہاڑی کے

ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ تو اس راستے پر تھوڑی دیر چلنا چاہئے اور روپل کی اس
ستھری اور ٹھنڈک والی صبح کو چلنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ کہاں جاتا ہے۔۔۔ اور
یہی ہماری غلطی تھی۔۔۔ وہ راستہ تقریباً پاگل پن کو جاتا تھا۔ یہ مجبوظ الحواس ہونے کا
آسان ترین راستہ تھا۔۔۔ اور ہم اس راستے پر چلے تو بالکل صحیح الدماغ تھے لیکن
تھوڑی دور چلے تو قدرے غلطی ہو گئے۔ یہاں ایک اور مقام آتا ہے جہاں میں بے
بس ہو جاتا ہوں۔۔۔

اس راستے پر ہم آہستہ آہستہ چلے اور سامنے برف پوش چوٹیوں پر دھند اترتی
تھی اور سرد ہوا کھلے گلے کی قیض میں جا کر بدن پر برف ہونٹوں کی طرح چلتی تھی۔
گھروندے کچے تھے اور کھڑکیوں میں سرخ رنگ کی چادریں دکھائی دے کر اوچھل ہو
جاتی تھیں۔ کھیتوں میں صرف یہ کہہ دینا کہ پھول تھے بہت زیادتی ہے۔ ان میں جو
رنگ تھے رنگوں کے جو چھینٹے تھے اور ان میں روپل کی وادی کے چھوٹے چھوٹے پتے
تھے جو راستے کے ساتھ ساتھ ہمیں دیکھتے ہوئے چلے تھے۔ ان بچوں کے لباس بے حد
دیدہ زیب تھے بلکہ وہی رنگ تھے جو کھیتوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں گلدستے تھے
جو ہمیں دینا چاہتے تھے لیکن جھجکتے تھے۔۔۔ ایک پیادری سی روپل بچی نے جس رنگ
کے پھولوں کا انبار تھام رکھا تھا بس اس کی گول ٹوپی میں وہی سب رنگ تھے۔۔۔ اور
جس کھیت میں وہ کھڑی تھی وہاں بھی وہی رنگ تھے۔ تو دیکھنے میں دشواری ہوتی تھی
کہ ان سب کو الگ الگ کیسے دیکھیں۔۔۔ میرا ان بچوں کو بلانا تھا لیکن ان میں جھجک
بہت تھی۔۔۔ میں تصویر اتارنے لگا تو وہ بھاگ جاتے۔۔۔ پھر اس راستے کے اختتام پر
ایک ایسا مقام آیا جہاں ایک شفاف نالی کے گرد گھاس تھی اور گلابی پھولوں کے ڈھیر
تھے۔ اور دور تک تھے۔

مجھے معلوم ہے کہ اس وقت میں مسکرائے چلا جا رہا تھا اور یہ مسکراہٹ ایک
غلطی انسان کی تھی۔۔۔ بس یہی جنتیں تھیں۔۔۔ یہی جنت کی حقیقت تھی۔۔۔ ایسی جگہوں
پر ہی لاکر تو انسان کو کہا جاتا تھا کہ اگر یہاں واپس آنا چاہتے ہو تو تمہیں مرنا ہو گا۔۔۔
اور وہ واپس آنے کے لئے مرنے لگے۔ لیکن یہاں واپس آنے کے لئے تو زندگی درکار
تھی۔ اور ہم خود آئے تھے لائے نہیں گئے تھے۔ بس یہ ہے کہ جب انسان اپنی
نارمل زندگی میں لوٹتا ہے تو اس کی مسکراہٹ میں فرق آچکا ہوتا ہے۔۔۔ یہ مسکراہٹ
کچھ بجلی سی حماقت اور پاگل پن کی طرف اشارہ کرتی ہے۔۔۔ اور اس مسکراہٹ میں

در اصل اس مقام پر واپس جانے کی خواہش کو نہیں لیتی ہے۔ اور اسی لئے ایک دنیا دار اور کامیاب شخص کی مسکراہٹ اور ایک آوارہ گرد کی مسکراہٹ میں فرق ہوتا ہے۔ آوارہ گرد وادی روہل کی سرد صبح میں پانی کے کنارے سرد ہوا میں حرکت کرتے پھولوں کے کھیتوں میں ہی رہ جاتا ہے واپس نہیں آتا۔ ہم بھی اپنے آپ کو وہیں چھوڑ کر واپس آئے اور بمشکل آئے۔

"صاحب کافی۔" سلطان نے دور سے پکارا۔ اور پھر کافی کا مک تھامے ہمارے پاس آگیا۔

"یہ پھول۔۔۔ پانی کے کنارے ہوتا ہے اور ہم اسے پانی کا پتہ کہتے ہیں۔" شینا زبان میں "اس نے میری جانب دیکھ کر کہا "بہت مصیبت ہے صاحب۔۔۔ ادھر فصل لگاؤ تو کم فصل بہت کم ہوتا ہے اور پھول بہت ہوتا ہے۔"

"یہ تو اچھا ہے سلطان۔" میر مسکراتے ہوئے بولا۔

"اچھا نہیں ہے ناں۔ کھانے کو کم ملتا ہے دیکھنے کو زیادہ ملتا ہے تو اچھا نہیں ہے ناں۔"

میں نے یکدم سر اٹھا کر سلطان کو دیکھا۔ اس نے کیا پتے کی بات کہی تھی کہ اگر کھیت میں فصل کی نسبت پھول زیادہ ہوں گے تو کھانے کو کم ملے گا اور دیکھنے کو زیادہ ملے گا اور یہ اچھا نہیں ہے۔۔۔"

"ویسے ادھر جو لوگ روہل میں رہتے ہیں وہ ترشک اور چورت والوں کی نسبت زیادہ کھاتے پیتے نہیں ہیں؟" ادھر زمین بہت اچھی ہے اور ادھر زیادہ پہاڑ اور پتھر ہے۔"

"نہیں ناں۔" سلطان نے پھر سر ہلایا "ادھر روہل میں بھی تو ہم لوگ ہی ہیں۔ اہر روہل میں چورت کے لوگ زیادہ ہیں اور لوہڑ روہل میں ترشک والے بہت ہیں۔۔۔ تمہیں بتایا تھا ناں کہ سردی میں سب ادھر واپس چلے جاتے ہیں۔"

جاپانی سیاح کوڑی بڑے اہتمام سے بال کھول کر ان میں کنگھی کر رہا تھا اور دور سے دیکھنے والا غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا تھا کہ کوئی سانولی حسینہ ہے جو پانی کے کنارے بیٹھی بالوں کے خم نکالتی ہے۔۔۔ کنگھی کرنے کے بعد اس نے چھوٹی سے چٹیا بنائی اس کے آخر میں ایک سرخ ربن باندھا اور پھر اپنا تھیلا شانے پر ڈال لیا "تمہیں روہل میں مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔۔۔ میں تم سب کو یاد رکھوں گا" اس نے باری باری

سب سے ہاتھ ملایا۔

"اگر تم سینگ میں یکپ جا رہے ہو تو وہاں ان دنوں ایک جاپانی ٹیم یکپ کر رہی ہے۔ وہاں تمہیں بہت سارے جاپانی مل جائیں گے۔"

"نہیں نہیں۔" اس نے بے یقینی سے سر جھٹکا۔

"ہاں۔ وہاں جاپانی ہیں تم ان سے ملو گے۔"

"پھر تو میں بالکل سینگ نہیں جاؤں گا۔ مجھے یہ خبر دینے کا شکریہ۔۔۔ کیونکہ جاپانیوں کو تو میں جاپان میں ملتا ہی رہتا ہوں۔ یہاں اتنی دور آکر بھی ان کی شکلیں دیکھوں تو کیا فائدہ۔۔۔ میں ٹاپ میدان جاؤں گا۔۔۔ ساہو تارا"

اور چند لمحوں کے بعد وادی روہل کے درمیان میں جو اکلوتا راستہ ٹانگا پریت کی جانب جاتا ہے اور جس کے ساتھ پانی بہتا ہے اور گل رنگ کھیت ہیں وہاں کوڑی چٹا ہوا دکھائی دیا اور پھر وہ ہماری زندگیوں سے ہمیشہ کے لئے ساہو تارا ہو گیا۔

آج پھر روہل سکول کے برآمدے میں بہت رونق تھی۔۔۔ راہی روہلی بچوں کے گفتگو چرے کیج کر رہا تھا۔۔۔ سلطان کارن فلیکس کے لئے دودھ گرم کر رہا تھا۔ بابا محمود گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اپنے سامنے کے خلا میں کم ایک ٹھہری ہوئی مسکراہٹ چرے پر سجائے بیٹھا تھا۔ وہ بہت کم ادھر ادھر دیکھتا اور جب کبھی دیکھتا تو صرف اپنے گدھے کی طرف دیکھتا اور بڑے پیار سے دیکھتا۔

اور ہمیں آج کہیں دور تو جانا نہیں تھا۔۔۔ صرف گھیشیز کے پار ترشک پہنچنا تھا۔۔۔ دوڑحالی گھنے کا نہٹا آسمان سبز اس لئے ہم جلدی میں نہ تھے۔۔۔ ہمارے پاس دنیا جہان کا وقت تھا۔۔۔ برآمدے میں بیٹھے ہوئے آپ کے سامنے جتنے کھیت تھے وہ سب کے سب کھانے کو کم دیتے تھے اور دیکھنے کو زیادہ اور ہم تو ادھر دیکھنے آئے تھے۔ سکول کے سامنے جو فصلیں تھیں ان میں تو مختلف رنگوں کے پھول با آسانی الگ الگ دیکھے جاسکتے تھے۔

اور پھر ترشک شروع ہو گئی۔

یہ ترشک ان غیر ملکی ٹریڈرز کی تھی جو آج صبح ترشک سے چلے تھے اور مازو پاس کی جانب جا رہے تھے۔ سکول چونکہ راستے کے ساتھ واقع تھا اس لئے ہر کوئی سانس درست کرنے کی غرض سے ہمارے پاس ٹھہر جاتا اور جو نہ ٹھہرتا اسے میر "ہیلو گڈ مارنگ" کہہ کر روک لیتا۔ یہ ایک مشغلہ بھی تھا کہ آپ ترشک گھیشیز کی

دیوار یا کنارے سے اترتے ہوئے راستہ کو دیکھتے اور غور سے دیکھتے رہتے اور پھر بتائیے کہ یہ جہز رنگ ہیں یہ کیتوں کے ہیں یا قیضوں، بیکنوں اور بلاؤڈوں کے ہیں۔ اور ان میں قیضیں کتنی ہیں اور بلاؤڈ کتنے ہیں۔

پہلے جرمنوں کا ایک گروپ نمودار ہوا۔ ان میں سے ایک نوجوان یورپا کے کسانوں کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ ایک اور جرمن رنگین پروں والا ہیٹ پہنے آ رہا تھا۔ جرمن خواتین جتنی بھی تھیں ناقابل ذکر تھیں۔ پھر دو آسٹریائی خواتین آئیں۔ انہوں نے راستے پر کھڑے ہو کر ہماری طرف غور سے دیکھا اور پھر ان میں سے ایک جھجکتی ہوئی آگے آئی ”ڈو یو سپیک انگلش؟“

”انگلش۔“ سلطان نے ہم تینوں کی طرف اشارہ کیا۔

”ہیں انگلش۔“ ہم نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا

”اوہ گڈ۔“ اس کی جھجک دور ہو گئی ”کیا ٹانگا پربت کے میں کمپ کو بھی راستہ جاتا ہے؟“

”ہیں میڈم۔“ راہی کر تک جھک گیا ”سیدھے چلتے جائیں۔ دریائے دوہل کے پار چلے جائیں پھر گلشیر کے دائیں جانب ایک سفید پہاڑ آئے گا۔۔۔۔۔ بڑا پہاڑ۔۔۔۔۔ بس یہی ٹانگا پربت ہو گا“

”ٹھیک یو۔“ اس نے نہایت خوش و غرم ہو کر کہا اور پھر اپنی ساتھی سے کہنے لگی ”یقینی یہ راستہ کیسے لوٹ کر لوں۔ کیسے ہم گم نہ ہو جائیں“

تھوڑی دیر سستانے کے بعد وہ پھر اپنے راستے پر تھیں۔

”ابو اکثر ٹیکر جو بوڑھے ہوتے ہیں ان کے دونوں ہاتھوں میں ہانگنگ سگس ہوتی ہیں۔ کیوں؟“

پتہ نہیں۔“

”میرا خیال ہے ایک سنگ تو ہانگنگ کے لئے ہوتی ہے اور دوسری بڑھاپے کے لئے۔۔۔۔۔“

”میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے فوراً اتفاق کرتے ہوئے کہا کیونکہ میں ابھی ایک سنگ کے ساتھ چلتا تھا۔ لیکن ان بزرگ قسم کے ہانگرز کو دیکھ کر کم از کم یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ صرف ہمت درکار ہے اور اگر آپ چل سکتے ہیں اور سانس لے سکتے ہیں تو آپ کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ اس دوران تین انگریز سیاح۔۔۔

ان میں سے ایک صاحب باقاعدہ ٹویڈ کوٹ اور گرے فلیٹ کی چٹون میں ملبوس۔۔۔ چلتے ہوئے آئے اور راستے پر کھڑے ہو کر ہماری جانب دیکھا۔ ان کے ہمراہ ایک بڑے بدن کی لڑکی بھی تھی۔ وہ آپس میں کھسک پھسک کر لڑکی کی آواز قدرے بلند تھی اور وہ کہہ رہی تھی کہ پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔ ٹویڈ کوٹ صاحب ہمارے قریب آئے اور کہنے لگے ”یہ ہوٹل آپ کا ہے؟“

”یہ سکول ہے۔“ میں نے انہیں بتایا ”ہم خود ہانگرز ہیں اور اس میں عارضی طور پر قیام پذیر ہیں۔“

ٹویڈ کوٹ نے ہنسنا شروع کر دیا۔ جی بھر کے ہنسنے کے بعد اس نے اپنا رک سیک اتار کر زمین پر رکھا اور لڑکی اور بقیہ انگریزوں کو پاس بلا لیا ”کیترین کا خیال تھا کہ یہ دسے ساڈر رستوران ہے اور آپ لوگ باہر کھڑے ہو کر گاہکوں کا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔ سوری“

کیترین ہی بڑے بدن کی لڑکی تھی۔ بہت بڑے بدن کی۔۔۔ اس نے ہمیں کے ساتھ ایک بہت ڈھیلی اور چوڑے نما قیض پہن رکھی تھی اور بس۔۔۔ اور لگتا یوں تھا کہ اس میں دو لدھر بچے گول منول سے کھس گئے ہیں اور کشتیاں کرتے ہیں۔

یہ چاروں حضرات جیولوجسٹ تھے اور ہالیوڈ کے گلیشیرز کے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہے تھے۔ ٹویڈ کوٹ کا کہنا تھا کہ وہ پاکستان کے شمالی علاقوں میں اپنی باقاعدگی سے آتے ہیں کہ ان کے برطانوی ساتھی جب کبھی انہیں یونیورسٹی میں دیکھتے ہیں تو حیرت سے کہتے ہیں کہ ہیں تمہیں انگلینڈ میں دیکھنا تو خوش قسمتی ہے۔۔۔ اور یہ کہ کیا کل پاکستان سے آئے ہو یا کل پاکستان جا رہے ہو؟۔۔۔ چونکہ یہ حضرات اور لدھر بچوں کی مالک خاتون ہمیں ہوٹل کے وینڈروغیرہ جان کر ادھر آئے تھے اس لئے ہم نے ان کو چائے پلا دی۔

ایک اور گروہ وارد ہوا اور اس کا تعلق مختلف یورپی اقوام سے تھا۔۔۔ سب کے سب دانشوروں کے ڈاکٹر تھے اور دانشوروں کے ڈاکٹروں کی کسی کو بچا کلب کے رکن تھے۔

ان کے بعد ایک جاپانی لڑکی چلی آئی۔ بالکل تھا اور بالکل خوش۔۔۔ سیدھی ہماری پاس آئی سب لوگوں کے ساتھ ہاتھ ملایا اور وہی ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی۔ جاپانی لڑکی کے بعد ٹریک کم ہو گئی اور ساڑھے دس بجے کے قریب بالکل ختم

ہو گئی۔ ترشک سے صبح سویرے چلنے والے اور ذرا دیر سے چلنے والے سب کے سب اس وقت تک گزر چکے تھے۔ ہمیں بھی روانہ ہونا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ترشک پہنچ کر ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس موضوع پر مکالمہ ایک مرتبہ پھر سلطان کے ساتھ ہوا۔

”ترشک سے گلٹ جانے کا کیا طریقہ ہے؟“

”صاحب پہلے تو استور پہنچے۔ گلٹ تو بہت دور ہے۔“

”تو استور پہنچنے کا کیا طریقہ ہے؟“

”ترشک میں اگر کوئی ایسی جیب آجائے جو مسافروں کو چھوڑ کر واپس جاری ہو تو اس سے بات کرو۔“

”کیا ایسی جیب آتی رہتی ہے؟“

”کیا معلوم! کبھی آتی ہے کبھی ہفتہ نہیں آتی۔“

یہ ”ہفتہ ہفتہ نہیں آتی“ سن کر ہم غاصے ٹھنڈے ہو گئے کہ اگر ترشک میں ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑا تو واقعی ٹھنڈے غار ہو جائیں گے۔

”ترشک سے استور جانے کا کوئی اور طریقہ بیان کرو۔“

”صاحب ادھر ترشک سے صبح سویرے ٹریکٹر ٹرائی پر بیٹھ کر رحمان پور کے پل تک چلے جاؤ۔“

”اور ادھر سے آگے استور کیسے جاؤ؟“

”ادھر تو صاحب دنیا کی ٹریک گزرتی ہے۔“

ہمارے ذہن میں کچھ اس قسم کا نقشہ آیا کہ اگر ہم ٹریکٹر ٹرائی پر اچھلتے ہوئے رحمان پور پہنچ جاتے ہیں تو وہاں استور جانے والے ٹریک کا جیم ہو گا اور ہم با آسانی جو جیب سامنے ہو گی اس میں بیٹھ جائیں گے ”تو رحمان پور پل سے ہمیں ہر صورت میں استور جانے والی جیب مل جائے گی؟“

”خدا معلوم۔“ سلطان نے کندھے سکڑ کر کہا۔ ”کبھی آتی ہے کبھی نہیں آتی۔“

”اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمیں ترشک سے دیوسائی پار کرنے کے لئے گھوڑے مل جائیں اور۔۔۔ اور کوئی اچھا سا خیمہ مل جائے اور ہم سکرو پہنچ جائیں۔“

”ہاں ناں۔“ سلطان نے سر ہلایا

”تارڑ بھائی۔“ راہی نے جو پیننگ میں مصروف تھا میری طرف دیکھا ”آپ ایک خواب کے پیچھے بہت دور تک جاتے ہیں۔“

”ہاں ناں۔۔۔“ میں نے بھی سلطان غاکل میں سر ہلایا۔

کے ساتھ ساتھ!

”سلطان ایک اور شلغم۔“

”ہاں ہاں۔“ اس نے دوسرا شلغم بھی اسی غلاست سے چھیلا۔ ایک بار چاقو اس پر رکھا اور تب اٹھایا جب پورا چھلکا ایک خوش نما ستارے کی صورت میں اتر گیا۔ میں بھی شلغم نوش کرنے لگا۔

روپل کی جانب سے تین گدھے چلے آ رہے تھے اور ان کو ایک نوجوان لڑکا ہانکا چلا آ رہا تھا۔ اور لڑکے کے کاندرے پر چڑے کا ایک ایسا منگیزہ تھا جو میں نے اس سے پشتر ہانکا۔ پریت کے دوسری جانب فستوری میں بھی دیکھا تھا اور میں جانتا تھا کہ ایسے منگیروں میں دی ہوتا ہے۔

”سلطان۔ اس میں لمبی ہے تو ذرا مانگ لو۔“

”ہاں ہاں۔“ اس نے لڑکے کو روک لیا۔ لڑکے نے بخوشی اپنا منگیزہ کھول کر ہماری ایک دیکھی میں ڈال دیا۔ یہ دی پانی کے بغیر تھا اور پیر کی شکل کا تھا۔ لڑکے نے بتایا کہ گھر پہنچنے پر اس کی ماں اس میں پانی ڈال کر لمبی بنا لے گی۔

وہاں واوی روپل کے چشمے کے کنارے۔ اس شلغم دی میں ہم نے چشمے کا خشک پانی ڈالا اور اس میں چینی ملائی اور انہیں ایک ڈوئی کے ساتھ خوب رڑھک کر شاندار لمبی تیار کر لی۔

”راہی چاہا۔ پی لو نہایت زبردست مشروب ہے۔“

راہی چاہا نے حسب عادت انکار میں سر ہلایا، منکراتے ہوئے۔

اور جب ہم لمبی پی رہے تھے اور شلغم کھا رہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ روپل کی جانب سے ایک دلا پتلا جاپانی لمبے لمبے قدم اٹھاتا چلا آ رہا ہے۔

”ابو۔۔۔ جاپانی آ گیا“ میر نے ہونٹوں سے لمبی کی سفیدی پوچھتے ہوئے کہا۔ ”شی می نو“ جاپانی نے اپنا نام سنا تو وہیں منجمد ہو گیا۔ جہاں تھا اور جس حالت میں تھا اور چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسے اس پر حملہ ہونے والا ہو۔ پھر اس کی نظر راستے کے ساتھ پتھروں کے درمیان ایلٹے صاف ٹھنڈک والے پانی کے کنارے بیٹھے ان حضرات پر پڑی جو لمبی پی رہے تھے اور شلغم کھا رہے تھے۔ اور وہ جتنا خوش ہو سکتا تھا اتنا خوش ہوتا ہمارے پاس آ گیا۔

”آہ۔“ اس نے سر جھٹک کر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور سب سے ہاتھ ملایا۔

”ترشنگ ایک تصویر“

ہم نے روپل پل چھوڑ دیا تھا اور ترشنگ جا رہے تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ ہم نے روپل سکول چھوڑ دیا تھا کیونکہ ہم ابھی اپنے دو پورٹرز اور دو گدھوں سمیت واوی و روپل کے کھیتوں کے درمیان چلے جا رہے تھے۔ سامنے ترشنگ کھیشیز کا بلند کنارہ نظر آ رہا تھا۔ اور وہ اتنا نزدیک نہ تھا جتنا نظر آتا تھا۔

راستے کے ساتھ ککڑی اور پتھروں کا ایک دو منزلہ گھر تھا جس کے ساتھ وسیع کھیت تھے۔ چھت پر ایک سفید مینڈھیوں والی بڑی اماں شوخ ٹوپی پہنے بیٹھی تھیں۔ ہمیں بہت دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں لیکن جب ہم نے دیکھا تو انہوں نے نہایت غصے سے منہ پھیر لیا۔ ان کے سامنے ایک دس گیارہ سالہ بچی اور ایک سنہری بالوں والا گول منول سا بچہ کھیل رہے تھے۔ اس گھر سے ایک نہایت ہنس کھ بڑھا باہر آیا۔ اور اس نے ہمیں تجھے کے طور پر پانچ شلغم عنایت کئے۔

آگے روپل کا چشمہ تھا۔ ہم وہاں بیٹھ گئے۔ ”آپ یہ کھاتے ہو؟“ سلطان نے تجیلے میں سے شلغم نکال کر پوچھا۔

”کیوں نہیں کھاتے ہو۔ بالکل کھاتے ہو۔“

اس نے چاقو کے ساتھ شلغم کو اس طرح چھیلا کہ اس کا چھلکا ایک ستارے کی شکل میں اتر آ اس نے چھلکا پھینک دیا۔ اور میری نظر اس پر تھی۔ میں نے ان علاقوں میں اکثر جنگوں پر راستوں چشموں اور ندیوں کے کنارے اس قسم کے ستارہ شکل کے چھلکے پڑے ہوئے دیکھے تھے۔ اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کس چیز کے چھلکے ہیں اور انہیں اتنی مہارت سے کس طرح اتارا جاتا ہے۔ میر نہایت ذوق و شوق سے شلغم کھا رہا تھا کیونکہ شلغم تازہ تھا اور روپل کے کھیت میں ابھی تھا پھولوں

”ادھر ہیں صاحب۔۔۔ جیب میں “ اس نے اپنی جیکٹ کی جیب کو زور سے تھپکا۔۔۔ ”دو ہیں۔۔۔“

اور یہ عجیب بات تھی کہ اس سفر کے دوران ہمیں وہ انڈے صرف اس وقت یاد آتے جب ہم ہینک کر رہے ہوتے یا راستے پر ہوتے۔ جب کبھی کھانا وغیرہ پکنا ہم انہیں فراموش کر دیتے۔ بلکہ روہل میں جب ہم نے مقامی طور پر کچھ انڈے خریدے تو اس وقت بھی ان کا خیال نہ آیا۔ ”سلطان“ ترشک پہنچ کر۔۔۔ کل صبح ہم ان انڈوں کا آلیٹ کھائیں گے۔

”ہاں ٹال۔۔۔“ اس نے سر ہلایا اور گدھوں کو بلندی کی جانب ہانکنے لگا۔ ترشک گمشیر کے کنارے پر پہنچ کر ہم رکے۔۔۔ نیچے ٹانگا پر بت سے آنے والا یہ گمشیر چٹوں اور لمبے کے نیچے سانس لے رہا تھا۔۔۔ جہاں کہیں برف پر لمبہ کم تھا وہاں مٹی میلی ہو رہی تھی۔۔۔ اور پانی کے چلنے کی آواز گرنے کی آواز ہم تک آتی تھی۔

دیوار سے نیچے اترنے کے لئے وہی راستہ تھا جس پر آتے ہوئے سمیر رک گیا تھا۔۔۔ سلطان سمیر اور گدھے آگے تھے۔۔۔ وہ اتر گئے تو میں نے قدم رکھا۔۔۔ بت ڈرتے ڈرتے کہ یہاں پاؤں ٹھہرتا نہیں تھا۔۔۔ میں جب اس مقام پر پہنچا جہاں سمیر رکا تھا تو یکدم میری ٹانگوں میں جان نہ رہی، میرے پاؤں جیسے الگ ہو گئے۔۔۔ اور ان کے نیچے سے بھر پوری زمین ٹھسکتی لگی۔۔۔ میرا سر پکرایا اور میں جہاں تھا وہیں پہلے تو ہمت کر کے کھڑا رہا یعنی گمشیر میں نہیں گیا اور پھر چھڑی کا سارا لے کر بیٹھ گیا۔ اور بیٹھا بھی اس طرح کہ میں وہاں زیادہ دیر تک اس پوزیشن میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔۔۔ سمیر نے نیچے پہنچ کر اوپر دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں جان بوجھ کر بیٹھا ہوں۔ یونہی سستانے کے لیے یا ذرا منظر دیکھنے کے لئے۔ اس نے ”ہیلو ابو“ کہہ کر ہاتھ ہلایا۔ میں جواباً ہاتھ نہیں ہلا سکتا تھا کیونکہ اس طرح میرا ٹیلنس خراب ہونے کا خطرہ تھا۔۔۔ میں جہاں تھا وہاں بالکل سانس روکے بیٹھا تھا۔ اس لمحے سلطان نے جو گدھے ہانکا گمشیر کے درمیان میں چل رہا تھا پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر مجھے وہاں نہ پا کر اوپر دیکھا۔ اور اس کی پہاڑی حس نے اسے بتا دیا کہ میں وہاں یونہی سستانے کے لئے یا منظر دیکھنے کے لئے نہیں بیٹھا ہوا۔۔۔ تھوڑی سی دیر میں وہ اوپر آچکا تھا اور اپنا ہاتھ آگے کر کے کہہ رہا تھا ”اسے پکڑو اور اٹھو۔۔۔“

ظاہر ہے سمیر اسے دیکھ کر بے حد خوش ہو رہا تھا ”شی می زدو۔ تم ماڈنڈو پاس ہو آئے؟“

”آؤ۔۔۔ نو پر ایلیم“ اس نے جواب دیا۔

”شی می زدو۔ کی پیو“

شی می زدو کو لسی پلائی گئی تھی اس نے ”آؤ۔ آؤ“ کر کے پیا جیسے کوئی چوڑہ پکڑنے کو ہو۔

ہماری گلگت نیم ایک مرتبہ پھر مکمل ہو گئی تھی۔

شی می زدو کی آمد پر ہم جس والمانہ خوشی اور بے لوث محبت کا اظہار کر رہے تھے اس میں کھوٹ تو نہ تھا۔۔۔ بس تھوڑی سی غرض مندی شامل تھی۔ اس کے یوں سردا مل جانے سے ہماری ایک پہاڑی مشکل حل ہونے کو تھی۔ شی می زدو نے چونکہ جیب ہینک گلگت ترشک اور پھر ترشک سے گلگت واپسی کے لئے بھی کراوائی تھی اس لئے۔۔۔ کم از کم شی می زدو کو لینے کے لئے ایک عدد جیب تو اس وقت ترشک میں موجود تھی یا اس نے بت جلد آنا تھا۔ اور ظاہر ہے ہم نے شی می زدو کے ساتھ پیار محبت کر کے اس کے ساتھ بیٹھ جانا تھا۔ اپنے حصے کا کرایہ ادا کر کے۔۔۔ چنانچہ ہم نے شی می زدو کے ساتھ پہلی بار جو گرجوئی سے ہاتھ ملایا تو وہ اس کو یوں سردا مل جانے کی خوشی میں تھا اور اس کے بعد جتنی بار ہاتھ ملایا وہ گلگت واپسی کے لئے جیب مل جانے کی خوشی میں تھا۔ ہم نے جب ایک مناسب وقفے کے بعد یونہی بریکسل تذکرہ اس سے اس جیب کے بارے میں دریافت کیا جو اسے ترشک سے لینے آ رہی تھی تو اس نے کانڈ پر ایک تاریخ لکھ کر بتایا کہ جیب پرسوں آجائے گی۔ اور کیا ہم کرایہ ادا کر کے اس میں گلگت تک سفر کر سکتے ہیں؟

”نو پر ایلیم۔۔۔“ اس نے فوری طور پر رضا مندی ظاہر کر دی۔ اب یہ ہمارا فرض تھا کہ ہم اگلے دو تین روز شی می زدو کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ شی می زدو کے ساتھ جو پورٹر تھا اس نے ہمیں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔۔۔ یہ وہی پورٹر تھا جسے احسان نے جلابانی کے ساتھ بھیجا تھا۔

ترشک گمشیر کی دیوار سامنے آگئی۔ ہم سانس جمع کر کے اوپر جانے لگے۔ اور اس موقع پر یکدم مجھے اپنے انڈے یاد آ گئے۔ ”سلطان وہ گلگت والے انڈے کہاں ہیں؟“

”مجھے اچھا لگتا۔“ میں نے ہاتھ آگے کیا ”میں اچھے وقت شاید گر جاؤں۔“
”تم بسم اللہ کرو۔“

سلطان نے میرا ہاتھ جیسے ٹکٹے میں کس لیا۔ میں جب اٹھا تو خاصا لڑکھڑایا۔
اور بے شکل سیدھا ہوا۔ اور وہاں بیٹھے رہنے کا فیصلہ درست تھا۔ اگر میں اپنے طور
پر اٹھنے کی کوشش کرتا اور اٹھا لڑکھڑاتا تو۔ ظاہر ہے نیچے جاتا۔
میں نیچے گلیشیر تک پہنچا تو میرا گھر مندی کے چہرے کے ساتھ میرا انتظار کر رہا
تھا ”آپ ٹھیک ہیں ابو؟“

ہم نے گلیشیر عبور کیا۔ دوسرے کنارے پر چڑھے اور جب اوپر پہنچے تو ہمیں
ہمارا پسندیدہ قصبہ ترشک نظر آنے لگا۔ ایک ہموار اور سرسبز علاقہ ”پھاڑوں میں
پوشیدہ“ درمیان میں ایک ویران ٹیلہ جس پر سیاہ پتئی لکڑی سے بنا ہوا ایک چوکور
ڈھانچہ۔۔۔ اور اس بلندی سے بھی پن پکلی کی آبشار نظر آرہی تھی۔۔۔

”نانکا پرست نورسٹ کا راجہ روہل ترشک“ کے تین نامکمل کمروں کی چھری
دیواروں کے ساتھ فرانسیسی سیاحوں کی پانچویں ایسی تک کھڑی تھی۔۔۔ وہ ماڈرن پاس سے
واپس نہیں آئے تھے۔ اس بار ہم اپنی پسند کا کمرہ حاصل کر سکتے تھے۔ یہاں کیفیت
ابھی تک وہی تھی۔ صرف چھری دیواریں ”فرش“ پر روڑی اور کھڑکیاں شیشوں کے بغیر
۔۔۔ لیکن واحد صمان ہونے کی بنا پر احسان اپنے گھر سے اون کا ایک بڑا کھیس ہمارے
کمرے کے فرش پر بچھانے کے لئے آیا۔ کھڑکیوں پر راہی نے پلاسٹک تان دیا اور
فرش پر زرد خیمہ اور اس پر سیلینگ بیگ۔۔۔ کھڑکی کی سل پر خوراک اور شیو کا
سلمان وغیرہ سجا دیا گیا۔۔۔

اور براہ کرم جوتے باہر اتار کر اندر آئیں۔ اور تھوڑی سی دیر میں یہ کمرہ اتنا
کوزی اور آرام دہ اور منفرد ہو گیا کہ باہر اگرچہ ترشک تھا لیکن باہر جانے کو ہزار جی
نہ چاہتا تھا۔

سلطان ہمارے لئے آخری کھانا تیار کر رہا تھا۔ کیونکہ اب ہمیں کسی پورٹری
ضرورت نہ تھی۔۔۔

کھانے کے بعد ہم سب ایک دائرے میں بیٹھ گئے۔ اور سلطان اور بابا محمود کے
دونوں کا حساب ہوا۔ جو حساب بننا تھا ہم نے اس میں اپنی خوشی سے اور سلطان کی
ان آنکھوں کی وجہ سے جن میں اس سفر کے دوران ہم نے کبھی لالچ کا کوئی شائبہ نہ

دیکھا۔ کچھ زیادہ رقم شامل کی۔۔۔ لیم کو اب جس ”ایکو منٹ“ کی ضرورت نہ تھی
مثلاً آلو۔ دال۔ چاول۔ خشک دودھ۔ ایک دیکھی۔ پٹلیں۔ چائے دانی وغیرہ سب
سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ ہم جب بھی کوئی چیز سلطان کی طرف بڑھاتے
کہ یہ تمہارے لئے ہے تو وہ نظریں جھکا کر اسے قبول کرتا۔۔۔

بابا محمود بھی بے حد خوش تھا۔ اسے بالکل خبر نہ تھی کہ اسے جو رقم دی گئی
ہے وہ کتنی ہے اور کس حساب سے ادا کی گئی ہے۔ لیکن وہ اسے ایک خواہشوں
سے بھری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتا چلا جاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بابا یہ رقم جوں کی
توں اپنے بیٹے کو دے دے گا۔ کیونکہ اس کے پاس اس کا کوئی مصرف نہ تھا۔ وہ
پوتوں کے اس جوڑے سے بھی مطمئن تھا جس پر چڑے کے بڑے بڑے پیوند کسی
مقامی موچی نے تعویذ رکھے تھے اور دونوں بوٹ یوں بھی الگ الگ تھے۔ ان میں
تھے نہ تھے بلکہ انہیں رسیوں اور چیتروں سے کسا گیا تھا۔ شاید وہ اس رقم سے
تسموں کا ایک جوڑا خریدے۔۔۔ لیکن کہاں سے۔۔۔ ہم نے دیکھا کہ بابا محمود اس رقم کو
مٹھی میں بھینچے مسکراتا ہوا باہر نکلا ہے۔ پھر وہ ترشک کے اس بازار کے قریب رک
گیا ہے جس میں فی الحال دو دکانیں ہیں جن میں سے ایک بند ہے۔ اور اس کھلی
دوکان سے پورے پانچ روپے کی نسوار خریدی ہے اور اس کی چنگلی منہ میں دبا کر
شانت ہوتا ہے اور مسکراتا ہوا اس راستے پر اتر رہا ہے جو چورت کو جاتا ہے۔۔۔

سلطان بھی خوش تھا لیکن وہ ہم سے الگ ہو جانے پر دکھی تھا۔ اور بولا کم
تھا۔ ادھر ادھر دیکھتا تھا۔ پھر اس نے حسب عادت زمین پر انگلیوں سے لکیریں کھینچتے
ہوئے کہا ”صاحب۔۔۔ ایک بات ہے۔۔۔“

”کیا بات ہے؟“ شاید وہ ادانگی سے مطمئن نہ تھا میں نے سوچا۔

”آپ کا بیچ تو پر سوں آئے گا۔ تو آپ کل ادھر میرے گھر آ جائے۔“

”بہت بہت شکریہ سلطان۔۔۔ لیکن مشکل ہے۔۔۔ ہم ذرا ترشک میں گھومیں گے

اور۔۔۔“

”میرا گھر جو ہے وہ صاحب لوگ کے لئے نہیں ہے۔۔۔ لیکن آپ کھانا کھاؤ جی

۔۔۔ گوشت تو نہیں ہے لیکن۔۔۔“

”بڑا مشکل ہو گا تمہارا گھر تلاش کرنا۔ ان پھاڑوں میں۔۔۔“ میری سمجھ میں

نہیں آ رہا تھا کہ میں اس شخص پر چار آدمیوں کے کھانے کا بوجھ ڈالوں یا نہ ڈالوں۔۔۔

"میں آؤں گا ناں۔" وہ یکدم چمکنے لگا۔ "ادھر آؤں گا اور سب کو لے جاؤں گا۔ کیوں میرے۔" اس نے خاص طور پر میرے ہاتھ ملایا۔

راہی گردن پر ایک انگلی سے کھجلی کرنے لگا۔ "سلطان۔ ہم تو مرج نہیں کھاتا۔ تو ہم کو کیا کھائے گا۔"

"ہم جانتے ہیں ناں۔ تھوڑا آلو۔ تھوڑا پیاز اور پانی میں ڈال کر دلیا موافق بنا لو جیسا ہم مونٹی کے لئے بناتا ہے تو وہ تمہارے لئے بنائے گا۔ کیوں نہیں بنائے گا۔"

"اب تو جانا پڑے گا۔" راہی خوش دلی سے ہنسنے لگا۔

"تو پھر کل آئے گا۔" سلطان اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے سے باہر گیا اور فوراً ہی لوٹ آیا اور اس کے ہاتھوں میں انڈوں کی پوٹلی تھی "میں یہ بھول گیا تھا۔ صاحب ایک رو گیا ہے۔"

ہم نے پوٹلی میں سے اس انڈے کو نکال کر ملاحظہ کیا جو گلگت سے چلا تھا اور نانکا پریت سے ہو کر صحیح سالم یہاں تک پہنچ گیا تھا "میرا اسے تم سنبھال لو۔ شام کو ہر صورت میں اس کا آلیٹ بنے گا۔"

سلطان بھی ترشک بازار کی اکلوتی دوکان کے سامنے رکا اور وہاں سے کچھ خریداری کر کے نیچے اتر گیا۔

ہم کمرے سے باہر آئے تو احسان جاپانی کو گھیرے ہوئے تھا اور ان کے قریب وہ پورٹر منہ پھلائے بیٹھا تھا جو مازنہ پاس تک اس کے ساتھ گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر جاپانی میرے پاس آگیا اور اپنی نوٹ بک پر "آف نو پراہلم" کہتے ہوئے کچھ لکھنے لگا۔ ادھر احسان بھی میرے کان کھانے لگا کہ جی یہاں سے مازنہ پاس تک اتنے یکمپ جتنے ہیں اور جاپانی پیسے کم دے رہا ہے۔ خاصی تحقیق کے بعد کھلا کہ احسان حسب عادت کچھ یکمپ دیکھ کر رہا ہے۔ چونکہ یہ پورٹر اسی کا نمائندہ ہے اس لئے جاپانی سے جتنی زیادہ رقم حاصل کی جائے گی احسان کی کمیشن بھی اتنی زیادہ بنے گی۔ جاپانی ان دنوں کا حساب کر رہا تھا جو سفر میں گزرے جب کہ احسان اور پورٹر کیمپس کا حساب کر رہے تھے۔ جہاں کہیں بھی ٹریکنگ کے لئے پورٹر حاصل کئے جاتے ہیں پہلے فیصلہ کر لیا جاتا ہے کہ ادائیگی دنوں کے حساب سے ہوگی یا یکمپ کے حساب سے۔ یعنی اگر تو

مازنہ پاس تک چار یکمپ کا سفر ہے اور آپ نے وہ سفر دو دن میں کر لیا ہے تو بھی ادائیگی چار دنوں کی ہوگی کیونکہ پورٹر زیادہ فاصلہ کم مدت میں چلا ہے۔ لیکن اس کا فیصلہ پہلے کیا جاتا ہے۔ بہر حال اس جھگڑے کا فیصلہ احسان کے بڑے بھائی محمد اشرف نے کیا جو اتنا دھیما اور شریف اشرف تھا کہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ احسان کا بھائی ہے۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" راہی کہنے لگا۔

"ترشک کی سفید گھیشیر ٹھنڈک میں اور اس کے کھیتوں میں بے مقصد گھومنا۔"

"اچھا پروگرام ہے۔ لیکن تارڑ بھائی ہم اتنے دنوں سے صرف ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ پہلے تو مجبوری تھی لیکن اب۔۔۔ کیا آپ میرا شکل سے آشنا نہیں کیے؟"

میں نے راہی کو غور سے دیکھا "میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو۔ کیا شکل ہے!"

"بالکل۔ اور آپ کی بھی کیا شکل ہے جو اتنے روز سے دیکھ رہا ہوں تو آج۔۔۔ ہم الگ الگ گھومیں گے۔ انسان کو کبھی اکیلا ہو کر بھی گھومنا چاہئے۔"

راہی پن بجلی کی جانب چلا گیا۔

"تمہارا کیا پروگرام ہے؟" میں نے میرے پوچھا۔

"میں تو ابھی آپ کی شکل دیکھ کر نہیں آتا یا ابو۔"

"گڈ ہوائے۔" میں نے خوش ہو کر اسے پیار کرنے کے لئے منہ آگے کیا تو وہ جھکا نہیں بلکہ جان بوجھ کر سیدھا ہو گیا تا کہ میری زود سے باہر ہو جائے۔ میں نے ایڑیاں اٹھا کر اس کے چہرے تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن دراز قامت بیٹوں کا سب سے بڑا نقصان یہی ہوتا ہے کہ آپ ان کی مرضی کے بغیر ان کا بوسہ نہیں لے سکتے۔ اور میر شرات کے موڈ میں تھا۔ میں نے ذرا روٹھنے کی اداکاری کی تو اس نے جھک کر کہا۔ "گڈ فائر۔"

ہم دونوں چلتے گئے تو جاپانی ہمارے قریب آکر کہنے لگا "نو پراہلم۔" جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کو بھی ساتھ لے چلیں۔۔۔

اور ہم نے اس پچھلے پر ترشک کی سفید گھیشیر ٹھنڈک میں اور اس کے

کھیتوں میں گھومنے کے سوا کچھ نہ کیا۔

اس نیلے پر بھی گئے جہاں چان نہا کڑی کا چوکور ڈھانچہ ترشک کے قدم باسیوں کی ہڈیوں کی رکھوالی کر رہا تھا۔ نیچے پورا ترشک سائے میں تھا اور دھوپ صرف رائے کوٹ پیک اور آس پاس کی بریلی چوٹیوں پر تھی۔ ہم نے دریائے روہل تک جانے کی کوشش بھی کی۔ جو نیچے بلند چٹانوں کے نیچے بہتا تھا۔

کھیتوں میں جگہ جگہ پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر تھے جو بے حد خوش نما لگتے تھے۔

ہم ترشک کو واپس آ رہے تھے جب شام اترتی تھی۔ اور جب ایک پن بجلی کے برابر پرانے گھر کی دیوار پر ہم نے ایک کسان کو دیکھا جو ہمیں دیکھ رہا تھا۔ جاپانی کی وجہ سے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ہم کون ہیں۔ "السلام وعلیکم" میں نے کہا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔" وہ فوراً باہر آگیا "چائے پیو گے؟"

"نہیں۔۔۔ آپ پانی پلا دیجئے۔"

"وہ مکان کے اندر جا کر گلاس لے آیا اور تیز روٹلی پر جھک کر اسے بھر لیا۔ "ترشک کا پانی اچھا ہے صاحب۔"

اس پن بجلی سے پرے۔۔۔ ترشک سے ہٹ کر کھیتوں کے بیچ ہمیں پوری دوپہر ایک خوش نما چینی طرز کی عمارت نظر آتی تھی اور ہم نے اس کسان سے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟

"وہ تو مسجد ہے صاحب۔ اور اس کے ساتھ امام باڑہ ہے۔"

ہم اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ترشک کی طرف چلے گئے۔

"ابو میں مسجد دیکھنا چاہتا ہوں۔"

شام میں وہ عمارت کھیتوں میں سے اٹھنے والی ہلکی تاریکی میں کم دکھائی دے رہی تھی "خاصی دور ہے۔"

"زیادہ دور نہیں ابو۔۔۔" اور وہ راستہ بدل کر ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ جاپانی نے بالکل نہیں پوچھا کہ ابھی اوپر جا رہے تھے تو ابھی دوسری طرف کیوں جا رہے ہو اس نے فوراً کانٹا بدلا اور میرے ساتھ چلنے لگا۔ یہاں بھی روہل کی طرح ہم

نے پھولوں کے انبار دیکھے جن کے رنگ اترتی شام میں سیاہی مائل ہو رہے تھے۔ ایک چشمے کے قریب گزرتے ہوئے پانی کی آواز کے ساتھ دو پرندے چھمکے۔ پتہ نہیں کہاں چھمکے۔ لیکن ان کی آواز میں بہت کشش تھی۔ وہاں صرف ایک درخت تھا اور ہم اس کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ وہ یقیناً اس کی شاخوں میں پوشیدہ تھے۔ وقفے کے ساتھ بولتے اور بہت محاس اور اپنائیت سے بولتے جیسے براہ راست ہم سے مخاطب ہوں۔ لیکن وہ ہمیں نظر نہیں آئے۔

اور وہ مسجد زیادہ دور نہیں تھی۔

کھیتوں میں گھری ہوئی ایک قدم لداغی طرز کی خاموش عمارت۔۔۔ جیسے بدھ بکشوؤں کا پوشیدہ مسکن ہو۔۔۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ لیکن وہاں ان دو پرندوں کی آواز پھر سے آنے لگی جنہیں ہم درخت کی شاخوں میں تلاش نہیں کر سکے تھے۔ عمارت کے ساتھ پانی بہتا تھا، اور بہت خاموشی میں بہتا تھا۔ یہاں دو چھوٹی چھوٹی عمارتیں تھیں۔۔۔ دونوں کے دروازے بند تھے۔ ہم نے ان میں سے ایک کا پرانا دروازہ دھکیلا۔۔۔ ایک تاریک کمرہ بلکہ سیاہ پوش کمرہ۔ کڑی کے تنوں اور شہتیروں کی چمکت۔۔۔ عباس ملدار کے علم۔۔۔ جلی ہوئی موسم بٹیاں۔۔۔ اخباروں میں سے تراشیدہ امام فہنی کی تصویریں۔ ایک کونے میں چندہ ہیں لائینیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان دنوں محرم کے دن تھے اور ہر شب وہاں غم حسین کو دل سے لگانے والے جمع ہوتے تھے۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔۔۔ دوسرے کمرے کے آگے ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ اس کے دروازے کی کڑی لگی ہوئی تھی۔ میں نے کڑی اتار کر اندر جھانکا۔۔۔ یہ ایک مختصر سی مسجد تھی۔ ایک مختصر سا کمرہ جس کے فرش پر کھالیں بچھی تھیں۔۔۔ کھڑکیوں کے شیشوں میں سے تھوڑی سی روشنی اندر آتی تھی اور یوں تھوڑی دیر بعد اشیاء تاریکی سے نکل کر واضح ہونے لگتی تھیں۔۔۔ جانوروں کی کھالوں کی گرم منک، خاک کرلا کی نکلیں، قرآنی آیات کے کتبے، مرصعے ہوئے جنگلی پھولوں کے دو ہار جو عراب میں پڑے تھے۔

"یہاں تو نماز پڑھنے کو جی چاہتا ہے ابو۔۔۔" میرا آہستہ سے کہنے لگا اور میرا بازو تھام لیا۔

اور وہاں اس نیم تاریک کھالوں کی گرم منک والے شام کی خنکی میں سرد ہوتے ہوئے کمرے میں ایک عجیب ٹھنڈا تھا۔ جیسے ہم دونوں باپ بیٹا وہاں آگئے

ہوں جہاں ہمیں آنا تھا۔ میں دنیا کی کئی معروف اور محبوب مسجدوں میں گیا ہوں۔۔۔ ان کی عظمت اور تاریخ نے مجھ پر اثر کیا ہے۔ ان کے ماحول نے مجھے بہت کچھ کہا۔۔۔ لیکن تڑشک کی اس ۱۰ x ۱۰ فٹ کی مسجد نے اور اس میں چھٹی زدہ اور بیخیزوں کی کھالوں کی گرم محکم نے مجھے کچھ نہیں کہا، صرف جھکنے کو کہا۔۔۔ ہم نے باہر آکر مسجد کے ساتھ بستے ہوئے بکشیئرز کے پانی سے وضو کیا۔۔۔ سر جھکائے، آنکھیں بند کئے اور ہاتھ باندھے ہم زدہ کی کھالوں پر کھڑے ہو گئے۔ ناک میں کھالوں کی محکم تیز ہو جاتی جب ہم سجدے میں جاتے۔ جب میں نے سلام پھیرا تو مجھے صرف ناکا پریت کی برقی نظر آئی تھی۔۔۔ ہم تڑشک جا رہے تھے تو کھیتوں میں تاریکی تھی لیکن ہم راستے سے آگاہ تھے۔

"مزا آگیا ابو۔۔۔" میرے میرا بازو تمام کر کہا۔

"ناکا پریت ٹورسٹ کا کچھ دوپل تڑشک" میں بڑی گما سہی تھی۔ فرانسیسی سیاح مانعہ پاس سے واپس آچکے تھے اور اپنی کامیابی کی خوشی میں جشن منا رہے تھے۔۔۔ چند موسم بیاں جو ریت کے ڈھیر کے اوپر رکھے ہوئے ایک تختے پر روشن تھیں، خالی بوتلیں اور ڈبے، پاکستانی موسیقی، فرانسیسی میں لوک گیت، دکنے چرے اور ستاروں بھری آنکھیں۔۔۔ اور خوشی اور مستی میں قلائیں بھرتا ہوا احسان۔۔۔ ہمارے کمرے میں راہی چاچا بیک صاحب کے دیئے ہوئے پچھ سنوڈ پر رات کا کھانا تیار کر رہا تھا۔ "آپ کے لئے بہت زبردست ڈنر بنایا ہے تارڑ بھائی۔۔۔ بہت زبردست سرراٹز جانتے ہو کیا بنایا ہے!۔۔۔ دال اور چاول۔۔۔"

"واقعی یہ بہت زبردست سرراٹز ہے۔" میں ہنسنے لگا "لیکن اس کے ساتھ تو ہم ایک انڈے کا آلیٹ کھائیں گے۔ میرا بیٹا انڈہ پیش کیا جائے" میرے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر انڈوں والی پوٹلی نکالی اور میرے سامنے رکھ دی۔ پوٹلی کچھ بیٹی بیٹی لگ رہی تھی۔۔۔ کیونکہ ہمارا آخری انڈہ بھی نوٹ چکا تھا۔

کھڑکی کی سل پر روشن موسم حق آدمی جل چکی تھی۔ میرا اور جاہانی سوچے تھے۔ فرانسیسیوں کی آوازیں بھی کم کم آتی تھیں۔ احسان کمرے میں داخل ہوا، جھکا

ہوا، کچھ سو گھٹا ہوا۔

"کیا بات ہے احسان؟"

"کچھ نہیں۔۔۔" وہ نہایت معصومیت سے مسکراتے لگا۔

"کچھ تو ہے۔۔۔"

"میرے پاس تو کچھ نہیں ہے" اس نے اپنی جیبیں الٹ کر دکھائیں۔

"تو پھر کوئی اور بات ہے۔"

"نہیں۔۔۔ کوئی اور بات بھی نہیں۔۔۔" اس کی مسکراہٹ مزید پھیل گئی۔

پھر اس نے پورے کمرے کا ایک طائرانہ جائزہ لیا اور کہنے لگا "آپ کے پاس پینے کے لئے کچھ ہے؟"

"کیوں نہیں احسان بھائی۔۔۔" راہی اپنے سیلینگ بیک میں سے باہر آگیا "بہت ہے پینے کے لئے"

"اچھا۔۔۔" احسان خوش ہو گیا "لے گا؟"

"کیوں نہیں لے گا؟" راہی نے پلاسٹک کین اٹھا کر اسے تھپکا "بہت ہے" اور پھر تام چینی کے مک میں پانی بھر کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ احسان نے بھرے ہوئے مک کو انتہائی اشتیاق سے دیکھا اور پینے سے چند لمحوں کے بعد کچھ شک میں جلا ہو کر ہماری جانب دیکھا اور پھر جلدی سے ایک گھونٹ بھرا۔۔۔ اور اس ایک گھونٹ سے احسان کی سرخوشی یکدم بجھ گئی۔۔۔ اس نے مسکراتے کی کوشش کی اور بیٹھی ہوئی آواز میں بولا "یہ تو پانی ہے۔۔۔"

"اور کیا چاہئے احسان۔۔۔" میں اس کی مایوسی سمجھتا تھا۔

اس نے پھر ادھر ادھر سو گھٹا۔۔۔ "یہ یو کیسی ہے؟"

راہی نے ناک سیڑ کر تھوڑی دیر غور کیا۔۔۔ یہ بو۔۔۔ اوہو احسان بھائی یہ تو ہم سنوڈ پر جب کھانا پکا رہا تھا، دال چاول، تو تھوڑا سا سپرٹ ادھر بوتل سے گر گیا تھا۔۔۔ یہ سنوڈ سپرٹ سے جلا ہے تو اس کا بو ہے۔۔۔ آپ کیا سمجھا؟

"کچھ نہیں۔۔۔" احسان سر جھکائے مایوسی میں غرق باہر چلا گیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے لگے۔

موسم حق کی موسم سل پر پھیل چکی تھی۔۔۔ اور بچنے کو تھی۔۔۔ تڑشک میں پہلی شب کی نسبت آج ہمیں زیادہ سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی، شاید ہم موسم کے

عادی ہو رہے تھے۔

ترشک کی واحد دوکان کے اندر میں نے گول سواری آئینے کو اپنے سامنے کیا۔ اسے فوراً اٹھایا لیکن پشت پر کچھ نہ تھا۔ پھر اٹھا کر سامنے کیا۔

دوکان میں روشنی کم تھی۔ گول سواری آئینہ میرے ہاتھ میں تھا اور اس میں ایک سفید واڈھی والا وحشی سا شخص مجھے دیکھ رہا تھا اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سرخی تھرتی تھی۔ پھر وہ سفید ریش بابا مسکرانے لگا اور اس کے دانت چمکنے لگے۔ میں بے اختیار ہو کر چہنے لگا کہ یہ میں ہوں، پندرہ روز کی کوہ نوردی نے مجھے کیا بنا دیا ہے، میں اپنے آپ کو پہچان نہیں رہا تھا۔ میں سواری آئینے کو روہو لا کر اپنی ایک جھلک دیکھتا اور چہنے لگتا۔

جاپانی نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر مسکرانے لگا جیسے قہقروں کا سبب جانتا ہو۔
"میں بابا ہو گیا ہوں۔۔۔" میں نے اپنی سفید واڈھی کو پیار سے چھپتے ہوئے کہا۔
"بابا۔۔۔"

"آہ۔۔۔ بابا" جاپانی نے سر ہلایا "نو پراہم"

”پورٹر سلطان کے کوہستانی گھر میں“

میں ترشک کی واحد دوکان میں سلطان کے بچوں کے لئے غانی کے پکٹ اور سواری آئینے خرید رہا تھا۔

اور پھر ہم سلطان کے کوہستانی گھر کی جانب چلتے تھے۔

جاپانی اور میرے آگے آگے چل رہے تھے۔ سلطان درمیان میں اور وہ ہمیں ترشک میں لینے آیا تھا اور اس کے پیچھے میں اور راہی۔۔۔

ترشک سے نیچے اتر کر نالہ عبور کر کے اب ہم دوسری پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔

”تارڑ بھائی کل ہم واپس چلے جائیں گے“ راہی کہنے لگا۔

”ہاں۔۔۔ اگر جاپانی کی جیب آگئی تو۔۔۔“

”لیکن آپ نے تو مجھے ڈر نکولا بنا دیا ہے۔۔۔ میری نسل تبدیل کر دی ہے“

میں نے اس پر راہی کی جانب دیکھا اور چونک کر دیکھا کہ یہ چاچا کیا کہہ رہا ہے لیکن وہ سر جھکائے متانت سے چلتا جاتا تھا ”ہاں میں ٹھیک کہتا ہوں۔۔۔ میں بالکل نارمل نسل کا انسان تھا۔ اسلام آبادی انسان جو اپنے کام سے کام رکھتا تھا لیکن آپ نے مجھے ڈر نکولا بنا دیا۔۔۔“

”وہ کیسے؟“ مجھے پوچھنا ہی پڑا۔

”یہ جو ڈر نکولا ہوتا ہے تو اس میں ایک خاص بات ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جب کبھی وہ کسی دوسرے نارمل انسان کو کاٹتا ہے تو دوسرا انسان بھی ڈر نکولا بن جاتا ہے“ اس کی نسل بدل جاتی ہے۔۔۔ اس سفر کے دوران، اوسر ترشک میں اور ٹاپ میدان میں۔۔۔ میری نسل بدل گئی۔ آپ کے پہاڑوں کے عشق نے مجھے بھی کاٹ لیا۔ اب

راستہ ختم ہو گیا اور ہم کھیتوں کے درمیان میں چلنے لگے۔ یہ "ٹاکے" کا علاقہ کھلاتا تھا۔ خشک پہاڑ کی آخری بلندی سے ذرا پہلے سلطان کا گھر تھا۔ روپل سکول جتنا صاف ستھرا، چھوٹا اور نکلی سے تعمیر کردہ۔ ذرا نیچے نکلی کا سنور تھا اور اس کے ساتھ مویشیوں کا باڑہ تھا۔ یہ باڑہ اندر سے بے حد تاریک تھا اور اس کی آخری کونٹھری بے حد خشک اور بغیر ہوا کے تھی۔ شدید سردیوں میں مویشیوں کو اس کونٹھری میں رکھا جاتا تھا۔ گھر کے ساتھ کھیت تھی۔ سلطان کا گھر ہماری توقعات کے برعکس خاصا شاندار تھا۔ برآمدے میں ایک دروازہ کھلتا تھا اور ہم اس کے راستے ایک چھوٹے سے صاف ستھرے کمرے میں داخل ہوئے جسے خصوصی طور پر ہمارے لئے تیار کیا گیا تھا۔

فرش پر ایک دھاری دار اونی دری بھی تھی۔ دیواروں کے ساتھ نیچے لگے ایک جانب چینٹ کی رضائیاں ترتیب سے رکھی تھیں۔ درمیان میں ایک پرائیویٹ ریکارڈر بیچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نکلی میں دو اگر بقیوں جل رہی تھیں۔ پینٹر سلطان کے ایک چاہاجی اور ایک مقامی سکول ٹیچر تشریف لائے تھے۔ جب ہم آرام سے بیٹھ گئے تو سلطان کے بچے کمرے میں آئے۔ انہیں آج خصوصی طور پر خوب مل کر نمایا گیا تھا اور وہ صاف ستھرے کپڑوں میں باقاعدہ دک رہے تھے۔ سلطان کی سب سے چھوٹی بیٹی اتنی گول منول جتنی گوری اور پیاری تھی کہ اسے دیکھتے ہوئے لگتا تھا کہ ہم شاید کسی دودھ یا گرائپ واٹر کا اشتیاق دیکھ رہے ہیں۔ جب میں نے انہیں وہ تحفے دیئے جو میں نے ان کے لئے ترشک میں خریدے تھے تو وہ عام بچوں کی طرح بے صبرے اور نریدے بالکل نہ ہوئے بلکہ تحفوں کو سینے سے لگائے آرام سے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔

سلطان کی نظریں مجھ پر تھیں۔ وہ میرے چہرے سے اندازہ لگا رہا تھا کہ اس کے گھر کو میں پسند کر رہا ہوں یا نہیں "صاحب ٹھیک ہے ناں؟"

"ہاں سلطان۔۔۔ لیکن یہ ٹیپ ریکارڈر ذرا بند کر دو"

ٹیپ ریکارڈر بند ہوا تو ایک خشک خاموشی جیسے اندر آگئی۔

سلطان کا چاہاجا باتیں کرنے لگا۔ صاحب ادھر اس پہاڑ پر ۱۵ سیر سے اپریل تک برف ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ برف ہوتا ہے ہم اتنا زیادہ خوش ہوتا ہے۔ ادھر ہم زیادہ تر منٹ، آلو، پھلیاں اور دال کاشت کرتا ہے آپ نے دیکھا کہ ابھی اگست کا مہینہ ہو گیا لیکن ہمارا گندم پکا نہیں شاید اس مرتبہ بالکل نہ کپے کیونکہ اس

میں نارمل انسان نہیں رہا۔۔۔ آپ کی نسل کا ہو گیا ہوں۔۔۔"

"یعنی میں ڈر نکلا ہوں۔۔۔؟ یہ میری تعریف ہو رہی ہے؟"

"آپ سمجھتے ہیں ناں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔۔۔" اور راہی بے حد سنجیدہ تھا "دیکھیں جب آپ کسی شخص کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گرد خوب گھماتے ہیں، پکڑ دیتے ہیں۔ اور پھر اس کا ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں تو اس کے بعد بھی اسے پکڑ آتے رہتے ہیں۔ مجھ کو آپ نے ہاتھ پکڑ کر گھمایا پکڑ دیئے۔ اور اب جب میں واپس جاؤں گا تو وہاں بھی مجھے پکڑ آتے رہیں گے۔"

ہم آہستہ آہستہ ترشک سے بہت بلند ہو چکے تھے۔ پوری وادی کا منظر ہم پہچے چھوڑتے چل رہے تھے۔ اور جب کبھی مڑ کر دیکھتے، وہ منظر زیادہ وسیع ہو چکا ہوتا۔ ترشک کی ہریاں برف پوش پس منظر اور کھیتوں میں مکان اور ان سے پرے ایک لداخنی طرز کی چھوٹی سی عمارت۔ روپل دریا کی گزرگاہ کی بلند دیواروں کے کنارے۔ اور ان کناروں کے درمیان میں جو بے حد پر کشش اور سرسبز میدان تھا اور وہاں ایک چھوٹا سا گاؤں بلندی پر براہمن تھا تو اس کا نام رائے پور تھا۔

اب سلطان ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔ اور ہمارے پوچھنے پر کہ تمہارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے وہ ماتھے پر ہل ڈال کر مسکراتے ہوئے کہتا "ادھر ہی ہے۔"

سلطان کے گھر کی جانب چلتے ہوئے ہمیں اپنے گھر یاد آئے۔ راہی کہنے لگا "کل میں کیچ کر تے ہوئے بنگالی گانا گا رہا تھا کہ دریا تیرا کنارہ نہیں ہے۔ تو یہ میں تب گاتا ہوں جب میں گھر کے لئے اداس ہو جاتا ہوں۔ لیکن تارڑ بھائی ادھر جو بلندی ہے اس کی وجہ سے گانا ٹھیک طرح سے نہیں گایا جاسکتا۔ ادھر آکسیجن کم ہے اس لئے جب بھی تان لگتا ہوں۔ آئے۔ آئے۔ تو میرا سانس ختم ہو جاتا ہے۔ دو کی بجائے صرف ایک "آ" کرتا ہوں اور خلاص۔۔۔ شاید اسی وجہ سے ادھر ناٹکا پریت کی وادی میں کلاسیکی موسیقی کا کوئی فیوچر نہیں۔۔۔"

باتیں جانب بہت ہی بلند چٹانیں تھیں اور وہ ہم پر بجلی ہوئی تھیں "ان چٹانوں میں سے گھاس لگتی تھی۔ گھاس میں کبھی کبھار کوئی شے حرکت کرتی۔۔۔ راہی رک گیا "باپ رہے۔۔۔ یہ کوئی جانور ہے۔۔۔ غور سے دیکھو"

سلطان آگے جا کر کھڑا ہو گیا "کیا دیکھتے ہو؟ اوپر مت دیکھو۔ اوپر ہمارا عورت لوگ گھاس کاٹتا ہے۔"

یہ عورت لوگ بہت بلندی پر تھا اور سردیوں کے لئے گھاس کاٹتا تھا۔

سال سردیاں لمبی ہو گئی تھیں۔۔۔

"سردیوں میں آپ لوگ گھر سے بالکل باہر نہیں نکلتے؟" سیر نے پوچھا۔

"کیوں نہیں نکلتے۔۔۔ باہر جا کر موسیٰ کو دیکھتے ہیں۔ چارہ ڈالتے ہیں۔ پانی لاتے ہیں۔۔۔"

میں نے ذرا مقامی ثقافت کے بارے میں اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہا اور ان سے شادی بیاہ کی رسوم کے بارے میں پوچھا، خاص طور پر موسیقی کے بارے میں۔۔۔

"شادی پر پہلے ہم ڈھول بجاتے تھے۔۔۔ سلطان کا چاچا کہنے لگا "اب منع ہے" کس نے منع کیا؟"

"اس نے۔۔۔" چاچا نے سکول ٹیچر کی طرف اشارہ کیا "اس نے کہا یہ اسلام میں نہیں کہ ڈھول بجاؤ۔۔۔" اس فقرے کے خاتمے پر سکول ٹیچر نے میری جانب قاتمانہ نظروں سے دیکھا اور میں نے جواب میں نہایت مدبرانہ انداز میں سر ہلایا۔۔۔

"کھاؤ ناں صاحب۔۔۔" اس نے ذرا شرمندہ ہو کر دعوت دی۔

اور یہ کھانا شاہراہ ریشم سے اس طرف ہمارا بہترین کھانا تھا۔۔۔ دسکی انڈوں کا کھن سے تیار کردہ "آلیٹ" خیرے پر اٹھے، گول ٹیک نما کی روٹی اور گاڑھی میٹھی لسی۔۔۔ یہ سب کچھ ہمارے لئے تھا اور راسی کے لئے ایک کنوڑے میں آلو اور پیاز کا پیکا حلوہ نما کھانا اور اسے راسی نے بڑے شوق سے دھیرے دھیرے کھایا۔

جب میں تین پرائیوٹوں کے بعد لسی کا چوتھا گلاس غٹا غٹ پی رہا تھا تو راسی کہنے لگا "آج میں اپنا پرہیز ختم کر کے اس لسی کو زانی کر دوں گا جو آپ بہت شوق سے پیتا ہے۔۔۔"

"بسم اللہ" میں نے لسی کا ایک گلاس اسے چما دیا۔ راسی نے ایک گھونٹ بھرا، کچھ دیر سوچ میں رہا پھر ایک اور قدروں پر اشتیاق گھونٹ بھرا اور پھر پورا گلاس پی گیا "تارڑ بھائی یہ تو گھول ہے"

"یہ کیا ہے؟"

"گھول۔۔۔" راسی نے دہرایا "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ یہ گھول ہے۔۔۔"

"مجھے معلوم ہوتا کہ یہ گھول ہے تو میں حمیں بتاتا کہ یہ گھول ہے۔۔۔ لیکن

راسی چاچا کیا واقعی یہ گھول ہے؟"

"ہاں۔۔۔ ہم اسے گھول بولتے ہیں۔۔۔"

دسکی انڈے، کھن، خیرے پر اٹھے اور گھول۔۔۔ اور سلطان کے اس پہاڑی گھر کے خشک کمرے میں خاموشی اور لمبی لمبی جھانپاں اور غنڈے سے بوجھل آنکھیں۔۔۔ ہم بڑی مشکل سے اٹھے اور بڑی مشکل سے باہر برآمدے میں آئے۔۔۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔۔۔ چٹانوں میں عورت لوگ گھاس کاٹنے کے لئے کبھی دکھائی دیتی تھیں اور کبھی کم ہوتی تھیں۔۔۔ اور ایک ہلکی خشک ہوا ٹانگا پریت کی جانب سے ہم پر اترتی تھی۔۔۔ اور ہم اس کے ساتھ سلطان کا بے پناہ شکریہ ادا کرنے کے بعد تڑخک کی طرف اترنے لگے۔۔۔ اس ٹانگا پریت کی جانب سے اترتی ہوا کے ساتھ۔۔۔ تڑخک کی طرف اترنے لگے۔۔۔

اس شام میں اور سیر ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے سے نکل کر کیتوں کی ٹھنڈک میں گئے۔۔۔ اور اس جانب چلے جہاں ایک ایسا درخت تھا جس پر دو پرندے چھپاتے تھے اور نظر نہیں آتے تھے۔ اس درخت کے آگے ہیرا دل میں گھری ہوئی پانی کے کنارے ایک عمارت تھی لداخی طرز کی۔۔۔ جو ہمیں سلطان کے گھر سے بھی دکھائی دیتی تھی اور ہم نے وہیں فیصلہ کیا تھا کہ آج شام ہم ضرور وہاں پہنچیں گے۔

مغرب کا وقت تھا۔ ہم نے خشک پانیوں کے ساتھ وضو کیا اور کمرے کے اندر جا کر ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔۔۔ تھوڑی دیر بعد ایک چینی شاہت کے بابا جی آئے اور اپنی ٹھوڑی سے لٹکتی ہوئی داڑھی سنوارتے آئے۔۔۔ وہ مسجد میں آئے اور ہمیں دیکھ کر ذرا ٹھٹھک گئے۔۔۔ کہ ہم اجنبی شکلوں کے تھے اور نیم تاریکی میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔۔۔ ہم نے سلام کیا تو وہ مسکرائے گئے۔۔۔ وہ مؤذن تھے۔۔۔

تھوڑی دیر میں مسجد بھر گئی۔۔۔ اور اسے بھرنے کے لئے دس پندرہ نمازی کافی تھے۔۔۔ یہ لوگ اندر آتے اور کسی کھال پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگتے۔۔۔ اور اکثر بلند آواز میں پڑھتے۔ شام کی خشکی میں کھالوں کی گرم منک میں اس مختصر عبادت گاہ میں۔۔۔ کوئی ہاتھ باندھے پڑھ رہا تھا اور کوئی ہاتھ چھوڑ کر۔۔۔ زیادہ تر بابے لمبے چوٹوں میں تھے اور چینی لگ رہے تھے۔۔۔

میں نے خیریت سے گھر واپسی کی دعا کی۔۔۔ اور کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشوں

میں سے ہانکا پریت کی سفیدی جیسے مسجد میں آتی تھی اور اس کی تاریکی کم کرتی تھی۔ ہم اندھیرے میں چلتے ترشک کو جا رہے تھے۔ اور خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک پگڈنڈی پر دو لائینیں حرکت کرتی ہوئی ہماری جانب آ رہی تھیں۔ ہم قریب ہوئے۔ سیاہ لباس میں دو لڑکیاں۔ انہوں نے راستہ دیکھنے کے لئے لائینیں اپنے چروں کے برابر کر رکھی تھیں اور روشنی کن کی زیادہ تھی یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ انہوں نے ہمیں یکدم سامنے پا کر حیرت اور ڈر سے اپنی زبان میں کچھ کہا اور پھر راستہ بدل کر کھیتوں کے اندر چلی گئیں۔ وہ مسجد کی جانب رواں تھیں اور مجلس میں شرکت کے لئے جا رہی تھیں۔

ترشک کے قریب چند اور لوگ ملے۔ وہ بھی لائینیں اٹھائے مسجد کی جانب جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان ہماری طرف آگیا، لائین اٹھا کر ہمارے چروں کے برابر کی اور کہنے لگا "صاحب گلگت سے آپ کی جیب آگئی ہے۔ ڈرائیور آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

رات ترشک میں چاند کی ایسی چاندنی تھی کہ اڑتا ہوا کوا سفید روئی کی پونی کی طرح سفید ہوتا تھا۔

ایسی چاندنی تھی کہ کمرے سے باہر نکلو تو لگتا تھا کسی عظیم تمبشیر کا سیٹ ہے جسے روشن کر دیا گیا ہے۔ ترشک کی کچی گندم کے خوشے الگ الگ نظر آتے تھے۔

”خوبصورتی کا خوف اور راما جھیل“

سلطان ہمیں الوداع کہنے آیا اور روائگی کے وقت مطلع ابر آلود تھا۔

ہم رحمان پور پل کے پار ہوئے اور جیب ایک چوڑے راستے پر اترتی جا رہی تھی جب ہم نے دیوسائی سے اترتے تیز ٹالے کو دیکھا۔ صاف شفاف آسمانوں سے اترتا انہیں کے رنگ کا پانی۔ اور یہ ٹالہ اتر رہا تھا اور اس کے پہلو میں راستہ اٹھ رہا تھا اور چلم چوکی کے راستے دیوسائی کو جا رہا تھا۔

ہمارے سامنے ایک راستہ تھا جو دیوسائی کو جاتا تھا۔

”رحمت خان جیب روک دو۔۔۔“

ڈرائیور نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ دیوسائی کے ٹالے کا شور جیب میں دھناتے لگا "بات کیا ہے صاحب؟"

"کچھ نہیں۔۔۔" میں جیب سے اتر کر کچے راستے پر کھڑا ہو گیا اور بلند پہاڑوں پر اٹکے ہوئے آسمان کے ایک چھوٹے سے حصے کو دیکھنے لگا جو یقیناً دیوسائی کے اوپر تھا۔ میں دیوسائی سے آنے والے پانیوں کو ایک دیوانے کے طرح گھور رہا تھا۔ یہ وہاں سے آ رہے ہیں جہاں میں جانا چاہتا تھا۔ جہاں خانہ بدوشی کرنے کی غرض سے میں گھر سے نکلا تھا۔ اس بار بھی اور اس سے پچھلے برس بھی۔ اور اب راستہ میرے سامنے تھا۔ اگر میں اور میری جیب میں سے اپنا سامان اتروالیں تو کیا ہو گا۔ شاید شام تھے پچھتر ہمیں کوئی اور جیب چلم چوکی لے جائے۔ شاید وہاں سے ہم دیوسائی کے لئے پورٹر حاصل کر لیں۔ شاید وہاں موسم اچھا ہو اور ہمارا نازک خیمہ شب بھری کے لئے کافی ثابت ہو۔ شاید۔۔۔ یہ پانی سیدھا دیوسائی سے آ رہا ہے، نیلا ایسا نیلا کہ بے شک اس میں کپڑے نیلوٹیل کر لو۔ اور یہ راستہ دیوسائی کو جا رہا

ہے۔ اور اگر ہم یہاں اتر جائیں تو شاید شام تک ہمیں چلم چوکی کے لئے کوئی سواری نہ ملے۔ اور شاید ہمیں کوئی پورٹر نہ ملے۔ اور شاید دیوسائی پر طوفان آیا ہو۔۔۔ شاید۔ اور اس صورت میں ہم وہاں اس مقام پر بے یار و مددگار پڑے رہیں گے اور کئی دنوں کی مشقت کے بعد گلگت واپس پہنچیں گے۔ اور اب ہم سیدھے گلگت جا رہے تھے۔ لیکن یہ راستہ دیوسائی کو جا رہا ہے۔ اور اگر میں بائیں ہاتھ مڑ جاتا ہوں تو اس سے دور ہوتا جاتا ہوں۔ شاید کبھی نہ آنے کے لئے۔

راہی پاکدان پر پاؤں رکھے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ میری محبت کو سمجھتا تھا۔۔۔ میرا اپنی چٹائی ٹوپی کو ماتھے پر کھینچ کر دیوسائی کے نالے کو دیکھ رہا تھا۔ اور وہ بھی جانتا تھا۔ "چلیں صاحب۔۔۔ ڈرائیور نے ہم سب کو یوں چپ کھڑے دیکھ کر کہا۔۔۔ وہ نہیں جانتا تھا۔

"راہی اگر میں یہ کہوں کہ ہم اس جیب کو ہمیں چھوڑ دیں اور۔۔۔ دیوسائی کے لئے قسمت آزمائی کریں تو تم کیا کو گے؟"

"میں بالکل تمہارے ساتھ ہوں مائی فرینڈ۔ آپ سوچ لیں۔ ویسے آپ دیوسائی کے بارے میں بہت جذباتی ہیں۔ پھر کسی۔۔۔ یہ قسمت بھی ہوتا ہے اور اگر قسمت بار بار کے کہ نہیں جاؤ۔ تو نہیں جاؤ۔"

"اور اگر میں پھر بھی جانا چاہوں تو؟"

"میں بھی چلوں گا۔۔۔ آپ فیصلہ کر لو ہم ڈرائیور سے کہہ دیں گے کہ ہمارا سامان کھول دے اور چالانی کو گلگت لے جائے۔۔۔"

میں تقریباً پانچ منٹ تک وہیں کھڑا رہا۔ راستے کو اوپر جاتے اور پانیوں کو نیچے آتے دیکھتا رہا۔۔۔ "ہاں۔۔۔ اگر قسمت بار بار کے کہ نہیں جاؤ۔۔۔ تو نہیں جاؤ۔" میں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور جیب میں بیٹھ گیا۔

جیب دیوسائی کے نالے کے اوپر سے گذری تو میں نے اس کی طرف دیکھا نہیں۔ ونڈ سکرین کو گھورتا رہا۔۔۔ پھر بھی اس کی فٹنڈک مجھ تک آئی۔

اور یہاں سے گر گیٹ دور نہ تھا اور وہاں دھوپ بہت تیز تھی۔ ہم رکے بغیر آگے نکل گئے اور جب وہ مقام آیا جہاں سے ایک راستہ اوپر استور کو جا رہا تھا اور نیچے استور نالے کے ساتھ ساتھ کچی سڑک بوئچی کو جا رہی تھی تو ہماری جیب استور کے لئے اونچی ہونے لگی۔ استور کی جو تصویر میرے ذہن میں تھی وہ بہت مختصر تھی۔ اونچائی پر چند ٹھارے اور ویرانی۔ لیکن استور اس تصویر سے بہت وسیع تھا۔

سڑک کے دونوں جانب سرسبز کھیت اور باغ تھے اور استور کے مرکز میں متعدد چھوٹے چھوٹے بازار تھے۔

ہم سستانے کی غرض سے فورسٹ کالج میں چلے گئے۔ اور کالج میں فی مربع فٹ کے حساب سے شمالی علاقہ جات میں سب سے زیادہ کھیاں پائی جاتی ہیں۔ یا شاید اس دوسرے خصوصی طور پر مجھے دیکھنے کے لئے آگئی تھیں، اس کے باوجود یہ کالج غیر ملکی فورسٹوں کی پسندیدہ رہائش گاہ ہے۔ ویٹرنے پکھا لگایا تو کھیتوں کی تعداد میں کم از کم پانچ فیصد کمی ہو گئی۔

ہم یہاں بیٹھے اپنے ڈرائیور کا انتظار کر رہے تھے۔ اور ڈرائیور پنڈول کی تلاش میں گیا تھا۔ یہ نہیں کہ ہمارے پاس گلگت تک کے لئے پنڈول نہیں تھا۔ گلگت تک کے لئے تھا۔ رامالیک تک جانے اور واپس استور تک آنے کے لئے نہیں تھا۔

بہت عرصہ پہنچا ایک سفر کے دوران ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم شمالی علاقوں میں کہاں کہاں گئے ہو۔ میں نے بتایا تو کہنے لگے "تم رامالیک تک نہیں گئے" میں نے عرض کیا کہ نہیں ابھی اتفاق نہیں ہوا۔ اس پر وہ صاحب باقاعدہ خفا ہو گئے اور بقیہ سفر کے دوران مجھ سے کلام تک نہ کیا۔

جب ہم بوئچی سے آگے استور کے تنگ دروازے میں داخل ہوئے تھے اور جب ہم استور کے نیچے سے گزرے تھے تب۔۔۔ مجھے بار بار ان کا خیال آتا تھا۔ اور رامالیک کی بے پناہ خوبصورتی کے ان تذکروں کا خیال آتا تھا جو میں نے فورسٹ گانڈز میں پڑھ رکھے تھے۔ کتنے جنگلوں اور وسیع سبزہ زاروں میں گھری جمیل جس پر ناز پرست کی برقیں جھکی ہوئی ہیں اور جو پاکستان کی خوبصورت ترین جمیل ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور آج صبح ترشک سے روتاگی کے فوراً بعد میں نے پہلے تو ڈرائیور کے ساتھ تعلقات خوشگوار کئے کہ۔۔۔ واہ واہ ڈرائیور تو وہ ہے جو استور روڈ پر مسافر کو جھکا نہ جھکنے دے اور ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جیب ایک ہی جگہ کھڑی ہے اور میں نے اپنی زندگی میں تم جیسا بالکل پہاڑی ڈرائیور کم ہی دیکھا ہے بلکہ دیکھا ہی نہیں۔ وغیرہ وغیرہ اور پھر یونی لاپرواہی سے پوچھنا شروع کر دیا کہ اچھا ہم گلگت کتنے بجے پہنچ جائیں گے؟ اگر ہم استور جا کر اوپر رامالیک تک ہو آئیں جو صرف دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے تو کیا اس صورت میں ہم شام سے پہلے گلگت پہنچ سکتے ہیں؟۔۔۔ ظاہر ہے عام ڈرائیور تو نہیں پہنچا سکتا اور اگر ہم رامالیک تک ہو آئیں تو سو روپیہ ٹپ تو معمولی بات ہے اور جو کتاب لکھی جائے گی اس میں نام آنا تو بہت ہی معمولی بات

ڈرائیور موم ہونے لگا۔ کتاب میں نام کے حوالے سے کم اور ٹپ کے حوالے سے ذرا زیادہ۔ ”ہمیں صرف ترشک سے گلٹ لانے کا آرڈر ہے۔ اور پھر پٹرول بھی صرف گلٹ تک کا ہے اور اگر استور میں سے پٹرول مل جائے۔ اور وہاں بہت مہنگا ہوتا ہے۔ اور اگر۔“

قصہ مختصر ڈرائیور پٹرول کی تلاش میں گیا ہوا تھا اور ہم استور کے نورسٹ کا مچ میں اپنی خشک چائے کو کھینوں سے بچاتے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

آزادی سے چھتر گلٹ اور شمالی علاقوں کو سری نگر سے جو سڑک ملاتی تھی وہ استور سے ہی گزرتی تھی۔ یہاں کے لوگ اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں کاروبار یا تعلیم کے لئے پہنچتے تھے۔ گلٹ میں پہلی جپ ۱۹۳۳ء میں اسی راستے سے آئی۔ سٹل سمندر سے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہونے کے باوجود اس دوپہر استور میں گرمی تھی اور کچھ چل رہے تھے۔

اور بالاخر ہم نے ڈرائیور کو استور بازار میں آتے دیکھا اور اس کے ہاتھ میں جو پٹرول کین تھا اسے وہ ذرا زور لگا کر اٹھائے ہوئے تھا ”مل گیا ہے۔ لیکن ذرا گندہ ہے۔“

ہم نے پٹرول ملاحظہ کیا تو وہ صاف ستھرے کپڑے کے رنگ کا تھا۔ لیکن ڈرائیور نے ہمیں تسلی دی کہ یہ جپ کو چلائے گا۔

جپ استور بازار میں سے نکلی اور پھر اس نے اپنی بو تھی روتے ہوئے کتے کی طرح آسمان کی جانب کر لی۔ اس کی اس حرکت کے نتیجے میں ہم بھی سامنے دیکھنے کی بجائے منہ کھولے آسمان کو دیکھتے تھے اور اس طرح بیٹھے تھے جیسے دندان ساز کی کرسی پر مریض منہ چھت کی طرف کئے بیٹھا ہے۔ اور یہ ساری کارگیری اس سڑک کی تھی جس پر ہماری جپ چل رہی تھی۔ اور چل تو کیا رہی تھی، دھچکے کھادی تھی، سیشل گیسٹر میں ہوٹک رہی تھی اور اس کے ہانڈوں کے ٹھسنے سے ریز کی بو فضا میں پھیل رہی تھی۔ میں نے اتنی یکدم اونچائی والی سڑک آج تک نہیں دیکھی تھی۔ ہمیں یقین نہیں آتا تھا کہ ایک عام سی جپ ہم پانچوں سواروں سمیت کیا اس بیڑمی پر چڑھ جائے گی جسے یہاں کے لوگ سڑک کہتے ہیں۔ اور یقین کیجئے وہ بہت مشکل سے چڑھتی تھی اور ہم ہمہ وقت واپس لڑھک جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ اور یہ راستہ کسی پہاڑ یا جنگل میں نہیں تھا بلکہ آبادی میں سے گذرتا تھا۔ اس پاس کھیت، فارم

اور بازار تھے۔ اس جپ رائڈ نے ہماری ہڈیاں پسلیاں کر دیں اور پسلیاں ہڈیاں کر دیں۔ جب آبادی ختم ہوئی تو سڑک ذرا بہتر ہو گئی۔ اور درخت گئے ہوئے گئے اور ان چیز کے درختوں میں سے کہیں کہیں برفوں کی ٹھنڈک نظر آنے لگی۔ پھر راما کا چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس نظر آیا۔ اور اس کے سامنے ایک اتنا ہی چھوٹا سا بلی پیڈ۔ راما ریسٹ ہاؤس کے بعد ہم ایک کھلی اور خشک اور وسیع کینڈین سٹائل کی لینڈ سکیپ میں آ گئے۔ ایک پتھروں میں بہتی گلیشیر کے سرمئی رنگ کے پانی کی ندی اس لینڈ سکیپ کی وسعت میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کنارے پر لمبے جنگلوں سے لائے ہوئے بے شمار شہتیر تھے جنہیں ایک ٹریکٹر ٹرالی پر لاوا جا رہا تھا۔ اس ندی کے پار ایک چڑھائی تھی اور ایک چھوٹی سی خشک پہاڑی تھی۔ جپ اس خشک پہاڑی پر چڑھنے لگی۔ پہلے پانی کا ایک چھوٹا سا ذخیرہ آیا، برفیلا اور ٹیلا اور اس کے بعد راما ایک سامنے آ گئی۔

یہ ایک ویران اور لمبوتری سی جمیل تھی جس کے پس منظر میں ٹانگا پریت کے سلسلے کی چند برف پوش چوٹیاں اور گلیشیر تھے لیکن اس منظر کا کچھ حصہ ایک لمبی ٹیلا نما خشک پہاڑی نے چھپا رکھا تھا جس کے نیچے گذریوں کی ایک چھوٹی سی بہتی تھی۔ جو ذرا نور کرنے سے نظر میں آتی تھیں۔ بائیں ہاتھ پر بلند پہاڑیاں تھیں جو سردیوں میں کسی گلیشیر کے نیچے ذبی رہتی تھیں اور وہ گلیشیر اب پگھل کر اپنے پیچھے نگر اور پتھر بکھرے ہوئے چھوڑ گیا تھا۔

ہاں ہم تھوڑے سے مایوس ہوئے۔ شاید ہم ترشک، روپل اور ٹاپ میدان کے بعد یہاں آئے تھے اس لئے۔ یا ہم جلدی میں تھے اور ہمارا ڈرائیور جپ کا ایکسپلرڈ ہوا کر ہمیں خبردار کر رہا تھا کہ ابھی ہم نے واپس استور جانا ہے، اصل سفر تو ابھی وہاں سے شروع ہو گا۔ شاید اس لئے! میرا خیال ہے یہ جمیل ”آئے اور دیکھ لیا“ والوں کے لئے نہیں تھی۔ یہاں ویرانی اور فاصلہ تھا اور اسے جاننے کے لئے اس کا حصہ بننا یہاں شب بسر کرنا شرط تھا۔

اس جمیل میں خوبصورتی اتنی نہ تھی، خوبصورتی کا خوف بہت تھا۔ یہاں انسان ایک ڈر میں رہتا ہے اور ہمہ وقت اس پاس دیکھتا ہے کہ کہیں بلند پہاڑوں میں سے۔ برفوں میں سے۔ ٹیلوں اور پتھروں کی اوٹ سے ہمیں کوئی دیکھتا ہے۔ وہ کون ہے جو ہم پر نظر رکھتا ہے۔ یہاں ایک غیر حقیقی ماحول کا احساس ہے۔ اس جمیل کی خاموشی اور برفانی پس منظر حقیقت سے دور خیال میں لگتے ہیں۔ آپ جمیل

کے پانیوں کے قریب جاتے ہیں تو ایک خاص زاویے سے وہ آئینہ ہو جاتے ہیں۔ ان پر ارد گرد کی برقی بلندیاں نقش نظر آتی ہیں۔ ایک اور مقام سے پوری جمیل گمرے سمرے رنگ کے آئینے میں بدل جاتی ہے۔ اگر آپ اپنے دھیان میں ہوں تو چلتے چلتے آپ جمیل کے پانی کو سبز زمین جان کر اس پر پاؤں رکھ سکتے ہیں۔ شاید حقیقت سے یہی دوری آپ کے اندر خوف بھر دیتی ہے کہ یہاں کچھ ہونے والا ہے، ہم غل ہوئے ہیں۔ یہ بہتی یہ جمیل کسی اور کے قبضے میں ہے۔

راما لیک جس جنگل ٹیلے کے پیچھے پوشیدہ ہے ہم اسے عبور کر کے ندی کے کنارے جنگل میں آئے تو ہم نے بہت بہتر محسوس کیا۔۔۔ ہم خوش تھے کہ ہم نے راما جھیل دیکھ لی ہے۔۔۔ اور ہم خوش تھے کہ ہم اس کی گرفت میں سے نکل آئے ہیں۔۔۔

”دھندلاتی ہوئی‘ ایک خیال میں..... نازنگا پریت“

استور واپسی پر جیپ نے اپنی بوتھی ہڈیاں حلاش کرنے والے کتے کی طرح زمین کے ساتھ لگا دی اور اگر ہم اپنے آپ کو قائم نہ رکھیں تو با آسانی وہ ڈیٹیلڈ میں سے لڑھک کر اپنی ہی جیپ کے آگے آسکتے ہیں۔ استور، راما جھیل روڈ کی اتراڑی، چڑھائی سے بھی زیادہ ناقابل یقین تھی۔ استور بازار سے گذر کر ہم دو کلومیٹر نیچے استور ٹالے تک آئے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ٹالہ نظر سے گم ہوا اور ہم استور روڈ کی بھول حلیوں میں گمشدہ بچوں کی طرح کھو گئے۔ وہی دورہ نما جھکی، خشکی، کچا راستہ اور چٹانوں کے ایک طویل غار جس میں آپ جا رہے ہیں اور آہستہ آہستہ سمت کا اندازہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ احساس بھی ختم ہو جاتا ہے کہ آپ کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ بس ایک سفر ہے۔ ایک موڑ کے بعد سڑک دور تک بل کھاتی نظر آ رہی تھی۔ اور وہاں ہم سے تقریباً سو میٹر کے فاصلے پر سڑک کے اوپر ایک کچا اور بھر بھری چٹان میں سے دھول کا ایک چھوٹا سا بادل نمودار ہوا اور نیچے آنے لگا۔ ڈرائیور نے جیپ روکی تو وہ دھول سڑک پر اتر رہی تھی اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کنگر نیچے آ رہے تھے، ان کے علاوہ ایک آدھ پتھر بھی تیزی سے گرنا ہوا سڑک پر آتا اور ٹالے میں چلا جاتا۔ دھول کا پھیلاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ڈرائیور جیپ سے اتر کر اس بادل کے قریب گیا، چند لمحوں کے لئے اوپر دیکھتا رہا اور پھر واپس آ گیا۔

”صاحب ادھر ابھی سلائیڈ ہونے والا ہے۔۔۔ اگر ہو گیا تو ہم آگے نہیں جاسکیں گے، رات ادھر ہوگی۔ شاید سڑک بند ہو جائے۔۔۔“

”جس طرح اوپر سے کنکر آ رہا ہے ہمارا تجربہ ہے کہ سٹائیلڈ تھوڑی دیر بعد نیچے

آئے گی ابھی اوپر وہ مٹی اور پتھر مل رہا ہے جو نیچے آئے گا۔ آپ پسند کرو تو ہم گزر جائیں؟“

”کیا ہمارے گزرتے وقت اوپر سے سلائڈ آ سکتی ہے؟“

”آ تو سکتی ہے۔ تو آپ فوراً بولو دیر ہو رہی ہے۔“

”تم کیا کہتے ہو۔“

”ہم تو کہتے ہیں چلو اللہ کا نام لے کر۔“

”تو چلو۔“

میر نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ ”آپ فکر نہ کرو ابو۔“

جیب کی لائٹس آن تھیں۔ ہم سڑک کے اس حصے میں سے گزرنے لگے جس پر دھول اتری ہوئی تھی۔ اوپر سے گرنے والے سنگر جیب کے بانٹ پر اولوں کی طرح گرتے ہوئے شور کر رہے تھے۔ ہم نے تھوڑی دیر دھول کو برداشت کیا پھر ہم سانس نہ لے سکے اور کھانسنے لگے۔ ڈرائیور کو سڑک نظر نہیں آ رہی تھی اور وہ صرف اپنے تجربے کی بنا پر گرنے سے بچ رہا تھا۔ یوں بھی سڑک پر اوپر سے خاصی مٹی آ چکی تھی اور اس میں ٹائر پھنس جانے کا خطرہ بھی تھا۔ اور یہ صورت حال تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی کہ آپ ایک لینڈ سلائڈ کے مین نیچے جیب میں بیٹھے ہوئے ہیں اور باہر بھی نہیں نکل سکتے۔

دھول کے اس بادل میں سے نکل کر جب ہم تازہ ہوا اور صاف سڑک پر آئے تو سب لوگ کھانسنے لگے۔

شاید اس خوفناک تجربے کا اثر زائل کرنے کے لئے۔ ممکن علاقے کی اس لینڈ سلائڈ کے بعد استور روڈ پر اس پچھلے پھر جب روڈ پر صرف ہماری جیب تھی اس روڈ پر اتنے پکڑے ہمارے سامنے آئے کہ ان کا شمار ممکن نہ تھا۔ اور جیب کے آگے آگے جیسے ہمیں خوش کرنے کو پرواز کرتے تھے۔ پھر استور ٹالے پر ٹکڑیوں کی صورت میں اڑتے تھے۔ اور پھر ہمیں ایسا لگا جیسے ہم کہیں نہیں جا رہے۔ یہ سفر نہیں ہے بلکہ ایک کھیل ہے جس میں ہم جیب میں سوار بے شمار پکڑوں کا پچھا کر رہے ہیں اور وہ ہم سے کھیل رہے ہیں۔ رانی، جاپانی، میر اور میں۔ ہم سب فٹ رہے تھے اور ممکن لینڈ سلائڈ کو بھول چکے تھے۔ اور ہماری آنکھیں صرف پکڑوں پر تھیں۔

روڈ ٹو استور از فل آف پکڑوں۔ نو پر ایلہ۔

اور پھر ڈھلتی دھوپ میں ہمیں اپنے سامنے ایک دروازہ نظر آیا جو باہر کی دنیا میں کھلتا تھا۔ استور کے پورے کے سامنے پل تھا۔ ہم اس پل پر گئے تو استور روڈ سے ہمارا رابطہ ختم ہو گیا۔ منظر وسیع ہو رہا تھا۔ استور ٹالے دریائے سندھ میں اندر تک جاتا تھا ایک گمرے اور خاموش ملاپ کے لئے۔

ہم استور کے درے سے باہر آ چکے تھے۔ جیب میں زیادہ روشنی تھی، زیادہ ہوا تھی اور زیادہ آسمان تھا۔ پونجی زیادہ دور نہ تھا۔ اور اس سے پرے ٹھٹھ تھا۔

اور پھر ہم ایک بہت ہی وسیع لینڈ سکیپ میں مختصر ہوتے چلے گئے۔

ہماری حیثیت کم ہوتی چلی گئی اور پھر جیسے ایک چوٹی جو ہماری جیب تھی کسی بے انت دیرانے میں ریک رہی تھی۔ آخر میں قراقرم بلند تھے۔ اتنے زیادہ بلند کہ وہ ایک دو دفعہ دیکھنے سے نظر نہیں آتے تھے۔ انہی بلندوں میں شاہراہ ریشم کا فیتر تھا اور اس کے نیچے سندھ تھا۔ یہاں ہوا بلا روک ٹوک چلتی تھی اور پوری لینڈ سکیپ میں شور بھرتی تھی۔

کسی نے ڈرائیور کو روکنے کے لئے کہا تھا۔ ہم باہر آ گئے۔ جیب کا رخ پونجی کی طرف تھا۔ لیکن ہم ادھر سے آئے تھے، خشک چٹانوں کی اس عظیم اور دہشت ناک دیوار میں سے جن کے اندر ایک راستہ تھا جو تاریک چٹانوں کے اندر ہی اندر استور تک جاتا تھا، ترشک تک جاتا تھا۔ ہم اس دنیا سے باہر آ چکے تھے۔

جیب اس وسیع اور دیران لینڈ سکیپ میں ایک چوڑے اور ہموار کچے راستے پر کھڑی ہے۔ راستے کے کنارے پر جاپانی اور رانی کھڑے ہیں۔ میر ان کے درمیان میں ہے اور یہ تینوں دیرانے کی وسعت سے پرے، خشک پہاڑوں کے پار بادلوں میں گم ہوتی ان برفوں کو دیکھ رہے ہیں جن کا نام ٹانگا پریت ہے۔ وہ یہاں سے بہت دور ہیں اور ان کی شباهت دھندلی ہے۔ رانی اور جاپانی اسے اپنے کیمروں کے لینز میں دیکھ رہے ہیں اور ٹانگا پریت کی اس آخری جھلک کی تصویر اتار رہے ہیں۔ اور میر اسے صرف اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور میں ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا انہیں اور ٹانگا پریت کو دیکھ رہا ہوں۔ اب تو وہ بہت دور ہے، ہماری پہنچ سے باہر۔ دھندلائی ہوئی۔ ایک خیال میں۔ لیکن اس کے نیچے کہیں ترشک تھا۔ واوی روپل تھی اور ٹاپ میدان تھا۔

”ٹانگا پریت کی چوٹی کے اوپر تک برف پگھل چکی ہے اور ٹاپ میدان بالکل سرسبز ہو چکا ہے۔ یہاں ہر جانب پھول ہی پھول ہیں اور کئی جگہوں پر لگا ہے کہ ہم

کسی کے پھولوں بھرے جھونپڑے میں آ گئے ہیں۔ پاک کے نیم جنگی ریوڑ اس روانوی 'دھنسی' پالہ 'نما' بلند وادی میں گھومتے ہیں اور مرل گھوڑے شدید سردی کے ستارے ہوئے یہاں گھاس چرنے آ جاتے ہیں۔ ٹاپ میدان ایک چراگاہ ہے اور بالکل ہموار ہے۔ ہمارے عین اوپر ٹانگا پریت کا روپل چڑھ رہا ہے جو قدموں سے چوٹی تک ساڑھے چار ہزار میٹر بلند ہوتا ہے۔ دھند ٹاپ میدان پر جھکی رہتی ہے اور اکثر بوند باندی ہوتی رہتی ہے۔"

"ہم نے عین سے ٹاپ میدان کی پہلی جھلک دیکھی۔"

ٹاپ میدان وسط ایشیا کی ایک عظیم چراگاہ کی طرح تھا اس کے وسیع سبزہ زار میں ایک دریا بہتا تھا اور زمین کے ساتھ لگ کر بہتا تھا اور اس میں چھوٹے ٹالے اور ٹالیاں شامل ہوتے تھے۔ زمین پانی کی بہتات کی وجہ سے اسٹنچ کی طرح نرم تھی اور اس میں لمبی لمبی گھاس اگ رہی تھی۔ دریا کے پار پورے ٹاپ میدان پر سایہ فگن ٹانگا پریت کا سفید شہر تھا۔ اس کی چٹانیں اس کی برہمن اور اس کی بلندیاں تھیں اور ان پر وحند تھی۔ گھاس کے وسیع قطعات میں مویشی چر رہے تھے۔ اور ٹاپ میدان کا یہ منظر ہزاروں برسوں سے ایسا ہی تھا۔ اور شاید ۱۹۸۹ء میں ہم وہاں نہیں تھے ہم کسی اور زمانے کے مسافر تھے جو کسی کارواں کے ہمراہ یہاں پہنچے تھے۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ جگہ موجود ہے۔ یہ ہماری منزل نہ تھی بلکہ اسے دیکھتے ہوئے ہمیں یقین تھا کہ ہم دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے کیونکہ ایسی جگہیں صرف ایک بار دکھائی دیتی ہیں اور پھر کہیں اور منتقل ہو جاتی ہیں۔"

تیسرا سفر

- ۱۔ ہوشے۔ ۲۲ کلومیٹر (جھیل کچورا۔ جھیل صدپارہ۔ وادی خیلو۔ وادی ہوشے) ۲۳۱
- ۲۔ وادی شگر ۳۷۱
- ۳۔ دیوسائی اے دیوسائی ۳۸۵

ہوشے ۳۳ کلومیٹر

(جھیل کچورا - جھیل صدپارہ - وادی خپلو، وادی ہوشے)

ایک کوستانی راستہ تھا۔ اس پر ایک دیگن دھول اڑاتی اس جانب جھکتی جاتی تھی جس جانب نیچے بہت نیچے شیوک تھا اور دریائے شیوک میں اوپر سے نکل کر تے تھے جو دیگن کے بازوؤں سے آ کر تیلوں کی طرح تیزی سے نکلنے تھے اور دیگن میں وادی خپلو کو جانے والے سوار تھے۔ اور تیز دھوپ میں دیگن کے جھکوں کو دانتوں سے ہونٹ دبا کر برداشت کرنے کی کوشش میں مجھے شیوک پر ایک پل نظر آیا اور اس پل کے ساتھ کچے راستے کے کنارے سال خوردہ گزری کے ایک تختے پر "ہوشے - ۳۳ کلومیٹر" لکھا نظر آیا۔ اور ہم بہت آگے جا چکے تھے۔ لیکن یہ "ہوشے - ۳۳ کلومیٹر" کا ڈیٹا کیس فیڈ ہو گیا۔

اس برس میں بلتستان کے سفر کے بعد فیئر میڈو گیا۔ پھر لاہور واپس آیا اور ایک معزز شہری کی طرح، ایک معزز تیل کی طرح زندگی کے کنوئیں میں سے رزق کا پانی نکالنے کے لئے آنکھوں پر کھوپے چڑھائے سر جھکائے زور لگاتا ایک دائرے میں چلنے لگا۔ اور اس دائرے میں چلتے چلتے جہاں مجھے دیوسائی میدان کی برقیں پھلتی دکھائی دیتیں اور ان میں سے تیز و تند اور نل کھلے سرد پانیوں کے ٹالے نیچے اترتے نظر آتے، اوہراستور سے آگے اگر گیٹ کے ساتھ جہاں سے ایک راستہ ٹالے کے ساتھ اوپر چلم چوکی کو جا رہا تھا، دیوسائی کے میدانوں کو جا رہا تھا۔ تو اس کے ساتھ کبھی کبھی مجھے "ہوشے - ۳۳ کلومیٹر" کا بورڈ بھی نظر آ جاتا۔ لیکن یہ ہوشے ہے کیا؟" مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ لیکن مجھ میں یہ خرابی تھی کہ وہاں پل کے پار ایک ویران کوستانی راستہ کیس جا رہا تھا اور وہ ہوشے جا رہا تھا۔ اور ہوشے پتہ نہیں کیا تھا تو مجھے جانتا چاہئے تھا کہ وہ کیا ہے، کہاں ہے۔ کیا میرے لئے بھی ہے؟

پھر کسی نے بتایا کہ ہوشے مشورہ پر پوش چوٹی مٹ برم کے دامن میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور وہاں صرف کوہ پنا اور ٹریکر حضرات ہی پہنچ سکتے ہیں۔ اور ہوشے کے لوگ صدیوں سے بلندیوں پر الگ تھلگ ہیں اور وہ بہت سادہ ہیں اور پیار کرنے والے ہیں۔ اور سادہ استے ہیں کہ اسی واوی کے ایک گاؤں میں چند حضرات نے آکر اعلان کیا کہ قیامت تو آگے جلد کو آ رہی ہے ابھی ابھی اطلاع آئی ہے اس لئے آپ لوگ جو کچھ آپ کے پاس ہے ہمیں عنایت کر دیں تاکہ ہم اسے محفوظ کر لیں۔ تو واوی ہوشے کے ان سادہ دل بندوں نے جو کچھ ان کے پاس تھا قیامت کی اطلاع دینے والے ان نیک حضرات کے سپرد کر دیا اور خود بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے لگے۔ تو ان بندوں کو دیکھنا بہت ضروری تھا۔

میں ایک مرتبہ پھر سکروڈ میں تھا۔ اس ہوا میں تھا جو سکروڈ کی واوی میں دیوسائی میدانوں سے اترتی تھی۔ سیاحتیں سے آتی تھی بیافو اور پالتورو کی ٹھنڈک سے آتی تھی اور سندھ کی وسیع گزر گاہ پر پھیلی تھی اور یہ ہوا اتنی شفاف اور سرویوسوں ایسی تھی کہ یہ بدن پر نیچے پاؤں چلتی تھی اور زندگی ہی زندگی تھی۔ اور اس مرتبہ میرے ساتھ سلوٹ "سیر" یعنی اور میونسٹی بھی تھے کہ یہ ان کا "سال" تھا۔ میرے اور میرے خاندان کے مابین ایک معاہدہ طے پا چکا تھا جس کی رو سے گرمیوں میں ایک برس تو میں اپنی من مرضی سے شمالی علاقے کے پہاڑوں میں دھکے کھا سکتا تھا لیکن دوسرے برس مجھے اہل خانہ کو بھی اس جبل خواری میں شریک کرنا ہوتا تھا۔ اور یہ ان کا "سال" تھا۔ بلتستان میرے لئے اجنبی نہ تھا۔ لیکن پچھلی بار واویء شکر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ دیوسائی میدانوں تک رسائی نہیں ہو سکی تھی اور۔۔۔ کہیں "ہوشے"۔ "کلومیٹر" کا بورڈ بھی آویزاں تھا۔

سکروڈ ایئرپورٹ کی ریلی وسعت میں جہاز رکھا۔

ایئرپورٹ سے باہر آئے اور میں کلومیٹر دور سکروڈ شہر کے لئے کسی سواری کے لئے نظریں دوڑائیں تو نظروں کے سامنے خواجہ سرداد کا مہماں چہو آگیا جو حسب معمول کسی رشتے دار دوست یا مہمان کو وصول کرنے کے لئے تیوڑی چڑھائے باہر آنے والے مسافروں کو بڑی ناگواری سے دیکھ رہے تھے ہمیں دیکھا تو کچھ دیر اپنی ناگواری برقرار رکھی پھر قدرے مسکرا کر کہنے لگے "آپ نے تو شاید ابھی چند روز بعد آنا تھا اور کار پر آنا تھا۔"

میں نے عرض کیا کہ آنا کار پر تھا بلکہ کار پر ہی آ رہے تھے کہ گو جراثیم کے

لواح میں کار کا وہیل بیلنس خراب ہو گیا اس لئے جہاز پر آنا پڑا۔
"اچھا۔۔۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا "اب ہمارا بینک بیلنس خراب ہو جائے گا۔ آپ جو آگئے ہیں۔ دیئے آپ کے لئے ایک آرامدہ کمرہ پالتورو ریسٹ ہاؤس میں بک ہو چکا ہے اور انہوں نے کوایا ہے۔ ان سے ملے۔"

ہم ان سے ملے۔ اور یہ ایک صحت مند گورے بچے چھوٹے خوبصورت ہاتھوں والے گڈا نما شخص تھے۔ "یہ وزیرِ قلب علی ہیں۔ گھانچے کے انجینئر ہیں۔"

"جناب السلام و علیکم۔" قلب صاحب نے اپنا پیارا سا ہاتھ آگے بڑھا دیا "بہت خوشی ہوئی۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہم آپ کے بھائی ہیں مسلمان بھائی ہیں۔" قلب علی یہ پیشکش اپنے قلب سے ہی کر رہے تھے یہ ہم نے بھی محسوس کیا۔

اس دوران ایک درمیانے قد کے بڑے اکڑوں اور سمارٹ سے میجر صاحب کھٹ سے میرے قریب آئے اور کاشن دینے کے انداز میں زور سے کہنے لگے "سر۔۔۔"

میں نے کہا "جی فرمائیے"

انہوں نے ایک مرتبہ پھر دروازہ یکدم زور سے بند کرنے کے انداز میں کہا "سر۔۔۔"

میں اس بار چپ رہا تو کہنے لگے "سر تارڑ صاحب۔۔۔ میرا نام میجر جمیل عباسی ہے۔ ایئرپورٹ پر اپنے سی دن تھری جہاز کو دیکھنے آیا تھا، یہاں سپلائی ڈپو کا انچارج ہوں میرے لائق کوئی خدمت۔۔۔"

میں نے بتایا کہ فی الحال خواجہ صاحب اور وزیر صاحب میری خدمت کر رہے ہیں اور مجھے مزید خدمت گزاروں کی ضرورت نہیں۔۔۔

"سر۔۔۔" میجر عباسی نے سر جھٹک کر کہا "اپنا رخ بدلا اور میری بیگم کو ایک زور دار "سر" کہنے کے بعد اس کے ساتھ محو گفتگو ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد بیگم میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں "یہ میجر عباسی تو بہت ہی ناکس چیز ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرے بال بچے ایک شادی کے سلسلے میں ایسٹ آباد گئے ہوئے ہیں میرا گھر خالی پڑا ہے آپ لوگ پلیز میرے گھر میں قیام کریں۔"

"ابھی تمیں سیکنڈ پہلے ملاقات ہوئی ہے اور ہم دندناتے ہوئے پورا خاندان ان

کے گھر میں قیام پذیر ہو جائیں؟۔ میں نے مجھے سے کہا "پتہ نہیں کس قسم کے فوجی ہیں۔۔۔ اور یہ بالکل مناسب نہیں۔"

"اسنے بے وقوف قسم کے فیئوں کے ساتھ آپ گزارہ کر لیتے ہیں یہ بے چارہ تو بہت ناکس قسم کا فین ہے۔"

میں نے بے چارے فین کی طرف دیکھا تو وہ بچوں کے ساتھ گپ لگا رہا تھا اور بچوں کے قصوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کافی فریک ہو چکا ہے۔

چنانچہ۔۔۔ اس صبح سکرود جاتے ہوئے ہم تھوڑی دیر کے لئے میجر صاحب کے خالی گھر میں رکے۔ یہ ایک خاص قسم کا بلٹی سرکاری گھر تھا جس کے صحن سے برپوش پہاڑ نظر آتے تھے اور اس کی دیواروں کے ساتھ خوبانی کی بھری ہوئی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔

"سوری میجر صاحب لیکن ہم رست ہاؤس میں ہی قیام کریں گے۔"

"سر۔۔۔" میجر صاحب نے فوراً کہا اور پیچھے ہو گئے۔

اس دوپہر ہم خواجہ مرداد کے باغ نما گھر میں کھانے کے لئے مدعو تھے۔ سکرود کی وہ ٹھنڈک والی خوش چلن ہوا جو جمیل صد پادہ کی جانب سے آتی تھی اور اس ہوا میں ایک رہائش گاہ جو تختہ در تختہ نیچے جاتی تھی۔ ایک تختے پر پارام اور خوبانیوں کا ایک مختصر باغ، اس کے نیچے نمازوں کے پورے، ایک تختے میں کھیروں اور خربوزوں کی جلیں اور ان کے آس پاس پھولوں کی کیاریاں اور ذرا جنگلی گھاس اور ایک مرد پانیوں کی چھوٹی سی نہر۔ میں نے خواجہ صاحب کو مسلسل حسد کی نگاہوں سے دیکھا۔

ہم بالٹورو رست ہاؤس میں واپس آئے تو میجر عباسی بھی نازل ہو گئے "سر۔۔۔ میں نے آپ سے پوچھے بغیر جمیل کچورا کے کنارے آری ہٹ میں آپ کے لئے دو کمرے ریزرو کروائے ہیں۔ آپ ذرا چل کر دیکھ لیجئے اگر پسند آجائے تو ٹھیک ہے ورنہ سکرود واپس آجائیے گا۔"

مجھے معلوم تھا کہ جمیل کچورا جا کر واپس کون آتا ہے۔۔۔

ہم عباسی کی آرام وہ فوجی جیب میں بازار جانب اترے تو سامنے "کے نو موٹل" کا بورڈ نظر آیا۔۔۔ "عباسی صاحب ذرا اوپر چلئے"

عباسی نے جیب موڑ کر اس راستے پر ڈال لی جو ہماری نظروں کے سامنے سیدھا ہو رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے جیب چڑھے گی نہیں بلکہ پچھلے پاؤں اترنے لگے گی۔

اوپر دریائے سندھ کو جھانکتی ہوئی ایک بلندی تھی جہاں سے وادیء سکرود کا

پھیلاؤ وسیع ہوتا دکھائی دیتا تھا، وہاں کے نو موٹل کی عمارت تھی۔۔۔

اس موٹل میں دنیا کے چار کونوں سے خواہشیں اور حسرتیں آتی ہیں۔۔۔ ان بلند یوں اور برقانی دیوانوں اور چٹانوں اور چوٹیوں کو دیکھتی ہیں جن پر وہ اپنے نقش پا ثبت کرنا چاہتی ہیں۔۔۔ یہاں سے ہر برس بے شمار مم جو اور کوہ نور نکلتے ہیں۔ اور کچھ بڑی ہوئی داڑھیوں اور جلی ہوئی رنگت اور برفوں کی ٹھنڈک سے جملے ہوئے چہرے لے کر واپس آتے ہیں تو ان کی خواہشیں پوری ہو چکی ہوتی ہیں، وہ دنیا کی کسی عظیم چوٹی کو زیر کر کے آتے ہیں، کسی طویل ترین گلیشیر کا سفر مکمل کر کے لوٹ آتے ہیں۔ اور کبھی کسی ہیلی کاپٹر میں ان کی لاشیں آتی ہیں۔ اور کبھی نہیں بھی آتیں کہ وہ برفوں کی کئی کلومیٹر گہرائی کے اندر گرتے ہیں اور وہیں منجمد ہو جاتے ہیں۔ اور کئی بار کئی برسوں کے بعد برفیں کھلتی ہیں تو یہ مردہ کوہ بنا دکھائی دینے لگتے ہیں۔۔۔ کے نو موٹل میں خواہشیں اور حسرتیں آتی ہیں۔ یہاں شاید دنیا کے عظیم ترین کوہ پکا اور مم جو آتے ہیں۔ اس کا ماحول صماتی ہے۔ اس کے سبز زار میں نیچے نصب ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی مم کا سالن بڑے بڑے نیلے ڈرموں میں بیک ہو رہا ہوتا ہے۔ اس کے برآمدوں میں اور ڈانگ روم میں جو گھنگو ہوتی ہے وہ صرف پہاڑوں اور ان پر جاتی مہموں کے بارے میں ہوتی ہے۔ کون کہاں جا رہا ہے۔ راستہ کونسا ہے اور کون کہاں گیا اور لوٹ کر نہیں آیا۔ اس کے سنگ روم کی دیواروں پر ۱۹۸۳ء سے اب تک جتنی مسات یہاں سے پہاڑوں میں گئی ہیں ان سب کے کارڈ نقشے اور تصویریں چسپاں ہیں۔ یہاں پر میسر کا ایک کارڈ بھی موجود ہے جس پر اس کے دستخط ہیں۔۔۔ ایک خاتون کوہ پکا کا یہ شکوہ بھی درج ہے کہ میں نے نو کی چوٹی پر اس لئے نہیں جاسکی کہ کوئی بھی ٹیکسی مجھے وہاں لے جانے کے لئے تیار نہیں ہوئی۔۔۔

کے نو موٹل مسات کا عجائب گھر ہے۔ اور میں وہاں اس لئے جا رہا تھا کہ مجھے وہاں سلمان رشید جیسے عجیب و غریب شخص سے ملاقات کی امید تھی۔ سلمان نے ایک عظیم ٹریکنگ مم کا جو منصوبہ بنایا تھا اور وہ لاہور میں اکثر میرے کان کھاتا رہتا تھا کہ بھائی جان میں ایک ٹچر خریدوں گا، اس کے ساتھ دوستی کروں گا اور پھر میں گوجر خاند بدوشوں کے کسی ایسے قافلے کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا جو کیل آزاد کشمیر کے راستے دیو سائی کے میدانوں کو جاتے ہیں اور وہاں سے خورد پن، گلیشیر اور بیافو گلیشیر اور پھر وادیء شیشال۔۔۔ اور تین ماہ کی اس خانہ بدوشی کے بعد میں انگریزی

میں ایک کتاب لکھوں گا جو یورپ میں شائع ہو گی اور پھر... سلمان ایک باتنی ہے
جین اور بے بس شخص تھا۔ اس کے اندر کوئی غیر مرئی طاقت تھی جو اسے بے بس
کرتی تھی۔ اس میں کوئی گمشدہ روح تھی کسی جنگی انسان کی جو راستہ بھول کر آبادی
میں آگیا تھا اور واپس جانا چاہتا تھا۔

سلمان رشید اپنے تازہ استراشدہ سر کی گولائی پر ہاتھ پھیرتا، اس کے لس سے
لطف اندوز ہوتا کے نو موٹل سے باہر نکل رہا تھا جب اس نے مجھے دیکھا اور ایک
پرست لبے میں چیخا۔ ”او بھائی جان۔“ میرے پاس کمائیاں ہیں۔“
”فی الحال ہمارے ساتھ جیب میں بیٹھ جاؤ ہم کچورا جا رہے ہیں راستے میں
کمائیاں سنیں گے۔“

بھائی جان جنم بھی آئی ہوئی ہے سکرود۔ مجھے ملنے کے لئے
جنم ایک اور بے بس روح ہے اور سلمان کی بیوی ہے۔
”اسے بھی ساتھ لے آؤ۔“

ہم کچورا جا رہے تھے اور سلمان اپنی کمائیاں بیان کر رہا تھا۔ ہم کچورا کے
کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور سلمان اپنی کمائیاں بیان کر رہا تھا۔ ”بھائی جان میں درہ
بابو سر کو عبور کر کے چلاں کے راستے استور پینچا اور پھر دیوسائی کر اس کرنے کے لئے
چلم چوکی تک آیا۔ لوگوں نے کہا دیو سائی پر تیس تیس فٹ برف ہے یعنی جون کی
۲۹ تاریخ کو اور چچور پاس پر تو کوڑ فٹ برف ہے لیکن میں اپنے دو بعد پورنرز کے
ساتھ چل پڑا۔ دیو سائی بالکل صاف تھا بھائی جان۔ البتہ پانی بہت تھا۔ مجھے پانچ
ندیاں عبور کرنا پڑیں اس طرح کہ میں ان کے کنارے کنارے چتا ان کے منہوں تک
پینچا اور سے دو سری جانب آیا۔ وہ کراسنگ جس میں دو دن گئے تھے اس میں چھ دن
لگے۔ دیو سائی ایک ایسا وسیع و عریض بیابان ہے بھائی جان کہ جو انسان کے رومانوی
کو جنگلے کے ساتھ ساتھ ایک عجیب اور گہرے خوف کا احساس بھی دلاتا ہے۔ ان چھ
دنوں میں میں نے اپنے پورنرز کی شکل کے سوا اور کوئی انسانی چہرہ نہیں دیکھا۔ ابھی
تک پھول نہیں کھلے تھے، صرف چھ قسم کے پھول دیکھے۔ اب میں وادیء شمشال
کے پورنرز کا بندوبست کر رہا ہوں جو مجھے بیافو اور برالدو کے راستے سیدھا شمشال پینچا
دیں۔ بھائی جان میرے ساتھ شمشال چلیں۔“

سلمان اپنی کمائیاں بیان کرتا رہا۔ جنم اسے ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھ رہی
تھی۔

آرمی ہٹ کے سامنے ایک سرسبز لان تھا، ذرا نیچے جمیل تھی اور اس میں دو
کشتیاں ساکن کھڑی تھیں اور سامنے خطرناک ہوٹل کی جتنی عمارت تھی اور اس کا
سرخ عکس پانی میں ٹھہرا ہوا تھا اور جب یہ سب کچھ تھا تو شام ہو رہی تھی۔
جمیل کچورا کے کنارے اگلے دو روز ایک آئینڈیل ہالڈے کے طور پر گزرے
۔۔۔ بچے پیڈل بوٹ میں سوار ہو کر جمیل کے درمیان میں چلے جاتے اور کشتی کے
کناروں پر ٹھوڑی سی ٹکائے پانی کی تھوڑی سی شیش گمرائی میں اگے ہوئے پودوں کو
حرکت کرتے دیکھتے رہتے اور ان میں تھوڑی سا ڈاؤٹ چھلیوں کو سبز کائی میں گم ہوتے
دیکھتے۔ میں اور میمونہ کنارے کے ساتھ بندھی ایک کشتی میں بیٹھے رہتے اور وہ
باتیں کرتے رہتے جن کے لئے میدانوں میں ہمارے پاس وقت نہ تھا۔ جمیل کے پانی
ہمارے سامنے رنگ بدلتے رہتے۔ ایک شام خطرناک کے عارف اسلم نے ہمیں اپنے
رستوران میں کھانے کے لئے مدعو کیا۔ اور اگلی صبح پھولوں سے سجا ہوا تازہ سرخ
اور بادامی جیروں کا ایک بھرا ہوا تھل بھیجا۔ یہ سکرود میں موسم کی آخری چیزیں
تھیں۔

ہماری ایک دوپہر کچورا گاؤں سے پرے خوبانی کے باغوں کے اختتام پر واقع اپر
کچورا جمیل کے کنارے گزری۔ جمیل کے پانی جیسے تھے ہی نہیں اور ان کی جگہ
ایک شفاف سا پردہ تھا جس میں سے بڑے بڑے پتھر اور درختوں کے تنے نظر آتے
تھے۔ اتنے شفاف پانیوں کو دیکھ کر ہم نہ رہ سکے اور کنارے کے درختوں کے
سارے پانی میں اتر کر اس کی خشکی سے اپنے شہری بدنوں کو آشنا کیا اور کپکپایا۔ میں
نے بچوں کو اس صبح کے بارے میں بتایا جب ہم پہلی بار اونہر آئے تھے اور سینکڑوں
پھلیاں سطح آب سے نمودار ہو کر اس پر گرتی تھیں اور ان کے گرنے سے جو دائرے
پھیلتے تھے تو کناروں تک آتے تھے۔ ہاں اس بار یہ محسوس ہوا کہ کچورا گاؤں اور
اس کے آس پاس کے بچے اور عورتیں سیاحوں کی کثرت کی وجہ سے بھکاری ہو چکے
ہیں اور اکثر بچے تذبذب کی حدوں کو پار کر کے سیاحوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ اپر کچورا
کے راستے میں ہر پھلتی پھولی نظر آئی اور افسوس اس لئے ہوا کہ جتنی بنیادی طور
پر بے حد سادہ اور پروقار لوگ ہیں۔ جمیل سے واپسی پر بارش شروع ہو گئی اور ہم
نچرتے ہوئے آرمی ہٹ میں داخل ہوئے۔

اسی آرمی ہٹ کے ایک کمرے میں ایک تحصیل دار صاحب فروکش تھے

راولپنڈی سے مجبوراً کسی سرکاری کام سے ادھر آئے تھے۔ سانس کے مریض تھے اور ہم نے انہیں جب بھی دیکھا ایک سٹول پر چڑھ کر شہتوت کے گھنے پتوں میں سر چھپائے پھل فروٹ کھاتے دیکھا۔ وہ بہت دیر تک کسی سفید اور دیلے شہتوت کو باقاعدہ آہیں بھرتے ہوئے دیکھتے رہے اور پھر یکدم اسے انگلیوں میں دبوج کر نوش کر جاتے۔ ایک روز چنڈی واہسی کے لئے ایئر پورٹ گئے، وہاں معلوم ہوا کہ جواز آیا تھا لیکن موسم کی خرابی کی وجہ سے واوی کاٹان سے ہی واپس چلا گیا ہے چنانچہ واپس آ گئے اور جیب سے اتر کر سیدھے شہتوت کے درخت کے پاس گئے، سٹول پر چڑھے اور شہتوت کھانے میں مشغول ہو گئے۔

کچھ گھنٹوں سے اوپر ایک کچا جیب ٹریک واوی سوکھ کو جاتا ہے۔ اور وہاں ایک پہاڑی ٹالے کے کنارے ایک چھوٹی سی کوہستانی بستی ہے۔ ایک خوبصورت گاؤں جہاں بہت کم لوگ جاتے ہیں۔ ہم نے کچھ لمبے وہاں بھی گزاریے۔

ان دونوں میں جمیل کچھرا نے ہم پانچوں کی وہ بے چینی جھین لی جو ہم شہوں سے لائے تھے۔ اس تھو کو ختم کیا جو میکانیکی زندگی کا تحفہ تھا اور پھر ہمیں اس کی جگہ نیلا شفاف سکون دیا اور پانچوں پر درختوں کے سبزے کا ٹھنڈا دیا۔

اور پھر ہم ایک جمیل کے کنارے سے اٹھے تو دوسری جمیل کے قریب پہاڑ ڈال لیا۔ اور یہ جمیل صد پارہ تھی۔ سکرو سے تقریباً دس کلومیٹر کی دوری پر۔ اس راستے پر جس پر سفر جاری رہے تو جمیل کے بعد صد پارہ گاؤں آتا ہے اور پھر بالاخر دنیا کا بلند ترین میدان دیو سائی۔

میں پچھلے برسوں میں دو مرتبہ اسے دیکھنے کی آس میں آیا تھا اور کبھی اس کی برہنہ نہیں چھلتی تھیں اور کبھی میرا خیمہ اس قابل نہ تھا کہ اس کی آب و ہوا کی شدت کو برداشت کر سکتا۔ اور میں جتنے دن صد پارہ جمیل کے کنارے رہا اسی راستے کو دیکھتا رہا جو پہاڑوں میں سے اٹھتا ہوا بلندی پر کسی نامعلوم چوٹی کے عقب میں بادلوں میں روپوش ہوتا تھا۔

کچھرا ایک نرم مزاج پر سکون اور تصویروں والی جمیل ہے۔ ہم صد پارہ ٹالے کے ساتھ چڑھتے جب جمیل کے قریب ہوئے تو جیب سے اترتے ہی صد پارہ کے اس چمٹے کا پانی جی بھر کر پیا جس میں سونے کے ذرات کی آمیزش ہے اور جسے میں نے صد پارہ گولڈ کا نام دیا تھا۔

جمیل کنارے عیسیٰ اور جعفر کا ایک چھوٹا سا "سیٹ اپ" ہے۔ پہلے ایک خیمہ ہوا کرتا تھا جہاں عیسیٰ سیاحوں کے لئے چائے اور بسکٹ کا بندوبست رکھتا تھا۔ اب وہاں ایک رستوران ہے، فرانسیسی کھانیاں جمیل کے پانیوں پر کھلتی ہیں اور آپ تکی ہوئی ٹراؤٹ پھلی نہایت نامناسب قیمت پر نوش کر سکتے ہیں۔

صد پارہ کے پی ٹی ڈی سی مونس میں ہماری پہلی رات تھی۔ اور ہم یہاں کے ٹو کے مونس انعام صاحب کی مہمانی سے آئے تھے۔ لائین کی مدد ہم روشنی میں جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو باہر ہوا بے حد تیز ہو رہی تھی اور جمیل کے پانی سمندر کی طرح شور کر رہے تھے۔

میں نے دیکھا کہ عینی کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور وہ بار بار کھانستی ہے۔ تھوڑی دیر میں اسے تیز بخار ہو چکا تھا اور اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ ہمارے پاس اسپرین تھی جس کی دو گولیاں اس نے بمشکل نگلیں۔ رات کے گیارہ بجے تو وہ ایک نیم ہڈیائی کیفیت میں تھی اور جانے کہاں کہاں کی اور کیا کیا باتیں کر رہی تھی اور روتی چلی جا رہی تھی کہ ابو مجھے سانس نہیں آ رہا۔ مجھے ٹھنڈے پینے آنے لگے، باہر ہوا بہت تیز تھی اور سردی تھی اور سکرو ایک خطرناک فاصلے پر بہت دور تھا۔ ہم سب عینی کے گرد بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے اور لائین کی روشنی میں اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس دوران عیسیٰ بھی آگیا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا لٹافہ تھا "صاحب اس میں کچھ دوائیاں ہیں انگریز فورسٹ چھوڑ گئے تھے۔ آپ دیکھ لو" میمونہ نے ان پر ایک نظر ڈالی اور سر ہلا دیا "نہیں۔۔۔ ان میں سے کوئی بھی مناسب نہیں"۔

"صاحب بی بی کو اگر سکرو لے جاتا ہے تو میں جیب کا انتظام کر لوں گا آپ فکر نہ کرو" میں نے میمونہ کی طرف دیکھا "نہیں ابھی نہیں۔ اس سرد ہوا میں اسے ایکسپوز نہیں کیا جاسکتا۔"

ہمارے پاس تھوڑا سا گڑ تھا۔ کھانے کے بعد ہم اسے سوٹ ڈش کے طور پر کھاتے تھے۔ میمونہ نے اسی گڑ سے شربت بنایا اور پھر اسے گرم کر کے عینی کو پلا دیا۔ اور اس کے ساتھ مزید دو گولیاں بھی کھلا دیں۔ مجھے اس رات بہت ڈر لگا۔ عجیب بے بس کر دینے والی صورت حال تھی۔ شاید اس صبح جب ہم اپر کچھرا سے واپسی پر تیز بارش میں بیٹھے تھے اسی کا اثر تھا۔ یہ تیز بخار اور رکتا ہوا سانس۔

تھوڑی دیر بعد یعنی اونگھنے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دیر تک اس چہرے کو دیکھتا رہا جو میری اولاد تھا میرے لئے پوری کائنات تھا۔ صبح کی سفیدی پھیلی تو میں کا بخار اتر چکا تھا اور وہ اطمینان سے سو رہی تھی۔

اب میں سونا چاہتا تھا کہ میر اور سلجوق آگئے۔ میر کے ہاتھوں میں ایک خشک راڈ تھا "ابو حسین کہتا ہے کہ اگر آپ اس وقت صد پارہ گاؤں کی جانب جانے والے پہاڑی راستے پر چلتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جائیں جہاں دیو سائی سے آنے والے چھوٹے نالے جمیل میں داخل ہوتے ہیں اور وہاں اس ڈوری کو ڈال دیں تو ٹراؤٹ مچھلیاں آپس میں لڑ لڑ کر بے حال ہو جائیں گی کہ پہلے میں کانٹے کو منہ ماروں گی اور۔۔۔ چلیں ابو؟"

ہم صد پارہ گاؤں جانے والے پہاڑی راستے پر چل رہے تھے۔ جمیل کے پانی بھی ساتھ تھے۔ پھر وہ پیچھے رہ گئے۔ نیچے جنگلی گھاس اور جھاڑیوں کا ایک نیم ریتا میدان تھا جس میں چھوٹے چھوٹے نالے بہہ رہے تھے اور جمیل میں شامل ہو رہے تھے۔ ہم نیچے اتر گئے۔ یہ ایک نہایت خفا اور خوبصورت علاقہ تھا اور ہمارے آگے پوری جمیل پھیلی ہوئی تھی۔ کناروں کے قریب سفید پانی تھے اور وہ پرے ہوتے تھے تو نیلے ہوتے چلے جاتے تھے۔ دائیں جانب پہاڑ میں وہ راستہ تھا جس پر ہم آئے تھے اور جو۔۔۔ دیو سائی کو جا رہا تھا۔

میر نے خشک راڈ اٹھایا اور اسے گھما کر ڈوری دور تک پھینکی اور کنڈی پانی کے نیچے جانے لگی اور اس کے ساتھ ہی وہ چرخی گھما کر ڈوری لپیٹنے لگا۔ وادی کانٹان کے علاقے سوچ میں دریائے کنار کے پانیوں میں سے ایک چاندی رنگ کی وزنی ٹراؤٹ میر نے ہی تو شکار کی تھی اور آج بھی وہ بے حد مطمئن تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ منہ لٹکائے ہوئے میرے پاس آیا "ابو میں کانٹے کے ساتھ آتا لگا کر ڈوری پھینک رہا ہوں جب کہ ٹراؤٹ پھلی تو صرف چپکتے ہوئے اور کھٹکتے ہوئے ٹکڑوں کی طرف آتی ہے۔۔۔ ہمارا بیٹ ٹھیک نہیں چمکتا ہوا دھات کا بیٹ چاہئے۔"

"یہ تمہیں پہلے سوچنا چاہئے تھا۔"

"آپ کیا کریں یہ بیٹی کی غلطی ہے۔ اس نے راڈ دیا تھا۔" اس نے پھر سے ڈوری کو پانی میں پھینکا اور بے دلی سے چرخی گھمانے لگا۔ ہمارے آس پاس کچھ نہ تھا سوائے آسمان کے، پانی کے پھیلاؤ کے، چھوٹے

چھوٹے برقانی بالوں کے اور اس راستے کے جو اوپر جا رہا تھا۔ اور اس شفاف وسعت میں صرف ہم سانس لیتے تھے اور خشک ہوا ہمیں وہ تازگی دیتی تھی جو کسی بخ بستہ جمیل کنارے کی گھاس تب محسوس کرتی ہے جب وہ ہوا کے ذور سے جھک کر سرد پانیوں میں ڈوبتی ہے۔

ہم واپس آئے تو گھٹتے ہوئے تھے اور بے حال تھے لیکن بے حد خوش تھے۔ لان میں خوبانی کے درخت تلے یعنی ایک کرسی پر بیٹھی تھی اور میونہ اس کے بالوں میں گنگھی کر رہی تھی۔ "ہلو ابو۔۔۔" اس کے لیوں پر وہ مسکراہٹ آئی جو ابو کے دل کے اندر تک اتر جاتی ہے۔

اسی شام بلکہ شام سے ذرا پہلے جمیل سے اوپر آنے والے راستے پر ایک باریش نوجوان چلا آتا تھا اور میری طرف چلا آتا تھا۔ یہ محمد علی چنگیزی تھا جو ہالیوڈ ٹریک اینڈ ٹورز نامی ایک ادارہ چلاتا تھا۔ بے حد متعارف اور خوشگوار عادتوں والا نوجوان۔۔۔ کے نوموس میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگا "ان دنوں میں ازاتیل شاء کے ساتھ ٹریکنگ کر رہا ہوں، وہ پاکستان کے مختلف ٹریکس کے بارے میں کتاب لکھ رہی ہیں۔" میں ازاتیل کا بے حد معترف تھا کیونکہ اس نے پاکستان کے بارے میں چار کتابیں تصنیف کی تھیں اور بے حد محبت کے ساتھ تصنیف کی تھیں۔ ازاتیل کا کہنا تھا کہ پاکستان ایشیا کا ایک ایسا راز ہے جو اب تک چھپا رہا ہے۔

میں سیکریٹ میرے قریب پہنچا "صاحب ازاتیل آتی ہوئی ہیں۔۔۔ میں نے آپ کا ذکر کیا تو وہ آپ سے ملاقات کی خواہش مند ہیں۔"

صد پارہ جمیل کے کنارے سفید بالوں والا ایک عمر رسیدہ شخص جمیل سے اوپر ان بادلوں کو دیکھ رہا تھا جن سے پرے دیو سائی کے میدان تھے۔ وہ انہیں دیکھتا اور پھر اپنے گھٹنوں پر رکھے کینوس پر رنگ لگاتا۔ وہ جمیل کو پینٹ کر رہا تھا۔ ازاتیل شوق رنگ کے کپڑوں میں اور رنگین عینک گلے میں لٹکائے اس شخص پر جھکی تھی۔ "اوہ ہلو میں ازاتیل ہوں۔" اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ ازاتیل ہیں اور میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے ملک کے بارے میں اتنی اچھی کتابیں لکھیں۔"

"آپ کا ملک اتنا اچھا ہے کہ اس کے بارے میں اس سے بھی اچھی کتابیں لکھی جانی چاہئیں۔ میں آئرش ہوں سوئزرلینڈ میں رہتی ہوں لیکن مجھے پاکستان زیادہ

پسند ہے۔ آپ آندرے روش کو جانتے ہیں؟“ اس نے کیوس پر جھکے بوڑھے کی طرف دیکھ کر پوچھا اور پھر کہنے لگی ”آندرے ایک اور شخص ہے جو پاکستان کے پہاڑوں کا شیدائی ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۳۳ء میں سری نگر کی جانب سے کنگور دیا کے علاقے میں گیا تھا اور اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ پوشیدہ چوٹی یا ہڈن پیک کو دریافت کیا جائے۔ اس کے بعد سے آج تک وہ باقاعدگی سے ان علاقوں میں آتا ہے اور پہاڑوں اور کوہ پیائی کے بارے میں تیرہ کتابوں کا مصنف ہے۔ یورپ میں بے حد مشہور ہے۔ اس برس ہم دونوں کے ٹو کے میں یکپ تک گئے تھے اور ابھی وہیں سے واپس آ رہے ہیں۔“

”بابائی کی موجودہ عمر کیا ہے؟“

”آندرے چوراسی برس کا ہو چکا ہے۔“

”تو یہ کے ٹو کے میں یکپ تک کیسے چلا گیا؟“

”بس اس نے ہمت کی۔۔۔ کچھ پورٹرز نے مدد کی لیکن واپسی بذریعہ ہیلی کاپٹر ہوئی۔۔۔“

”کے ٹو کے میں یکپ تک جانے کا خواہش تو میرے دل میں بھی ہے لیکن۔۔۔ میرا خیال تھا کہ میں اس پندرہ دن کے طویل اور پرخطر راستے کے لیے ذرا عمر رسیدہ ہوں۔۔۔“

ازائیل ہنسنے لگی ”اب تم جان گئے ہو گے کہ اگر تم میں ہمت ہے تو تمہارے پاس ابھی بہت برس ہیں کے ٹو کے میں یکپ تک جانے کے لیے۔ بس اپنے آپ کو ذرا سنبھالنا پڑتا ہے، دریائے برالدو کے اوپر چٹانوں کے ساتھ ریگتے ہوئے اگر تم بلندی سے گھبرا جاؤ تو بس سیدھے دریا میں۔۔۔“

اس دوران چنگیزی نے اگر اطلاع کی کہ کیمرو یونٹ جمیل کے قریب بابائی کا منتظر ہے۔

”راہٹ سکاور ایک بہت ہی مشہور آسٹریں کوہ چٹا ہے۔ وہ ایک ٹیلی ویژن ادارے کے لئے آندرے کا انٹرویو لے رہا ہے۔ تم بھی آؤ۔۔۔ کم آن آندرے۔۔۔“

آندرے اپنی پیٹنگ میں بے حد محو تھا، اس نے سر اٹھا کر ازائیل کی طرف دیکھا کہ کیا یہ بہت ہی ضروری ہے کہ میں جمیل کی تصویر بنانا چھوڑ دوں اور کیمرو کے سامنے بیٹھ کر انٹرویو دوں؟ ازائیل نے ایک مرتبہ پھر کہا ”وہ انتظار کر رہے ہیں

آندرے“

”میری پیٹنگ کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔۔۔“ آندرے نے سب لوگوں سے کہا اور پھر چنگیزی کا سارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

جمیل کنارے ایک بڑے پتھر پر آندرے بیٹھا ہوا تھا اور کیمرو میں آنکھ لگائے خوش شکل راہٹ کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا ”مجھے پاکستان سے بے حد محبت ہے اور یہ محبت ۱۹۳۳ء میں شروع ہوئی۔۔۔ میں بلند ترین چوٹیوں پر پہنچا۔۔۔ کتابیں لکھیں اور ان سفر کے دوران فلمیں بنائیں۔۔۔ میرا کیمرو صرف قدرتی مناظر کو دیکھتا تھا۔ بادل۔ سورج کا طلوع اور غروب۔۔۔ خاص طور پر طلوع کے وقت پہاڑوں میں ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے۔۔۔ میں اس عمر میں بھی ان مناظر کو دیکھتا ہوں تو میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔۔۔“

راہٹ نے ایک اور سوال کیا ”کیا آپ کو مہم جوئی سے بے حد دلچسپی تھی اس لیے آپ ۱۹۳۳ء میں موجودہ پاکستان میں آئے؟“

”نہیں بالکل نہیں۔۔۔“ آندرے کہنے لگا اور جمیل کے پانڈوں سے اس نے اپنے پاؤں کو پھلایا ”میں نوجوان تھا۔ بیکار تھا۔ بیروس کے ایک اخبار میں ایک اشتہار شائع ہوا کہ ہمالیہ کی نامعلوم وادیوں میں جانے کے لئے جسمانی طور پر مضبوط نوجوان درکار ہیں۔۔۔ بس میں نے سوچا کہ کچھ پیسے بنائے جائیں اور پھر میں زونٹی لاء درے کے راستے ادھر آ گیا۔“

شام گہری ہو رہی تھی اور خنکی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں آندرے کی پرست شخصیت کو دیکھ رہا تھا کہ وہ کس طرح اس عمر میں پوری طرح زندہ ہے اور ہم کس طرح اس عمر میں کتنے مردہ ہو چکے ہیں۔۔۔

انٹرویو سے فارغ ہو کر آندرے میری جانب آ گیا ”مجھے ازائیل نے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔۔۔ تم میری طرح کے شخص ہو۔۔۔ آؤ باتیں کریں۔۔۔ اور آندرے کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اس کی زندہ دلی اور زندگی کو آخری سانچوں تک پرست رکھنے کا جذبہ میرے اندر بھی سرائت کر رہا ہے۔۔۔“

”اور اگلے برس تم کوئی چوٹی پر پہنچو گے آندرے؟“

”ہاں۔۔۔ میں اسی چوٹی پر پہنچوں گا اگلے برس۔۔۔“ اس نے انگوٹھے سے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور ہنسا ”وہ چوٹی جس پر پہنچ کر تم واپس نہیں آ سکتے۔۔۔ لیکن فی الحال

مجھے سکرو پہنچا ہے۔

ہم موٹوں کے ساتھ اوپر پارکنگ تک جانے والے راستے پر چلے گئے۔ یہاں شدید چڑھائی تھی۔ آندرے سانس لینے کے لئے رک گیا۔
”یہ چڑھائی تو کچھ بھی نہیں ہے آپ تو ٹانگا پر تھک جا چکے ہو۔“ ازانہل نے مذاق سے کہا۔

”میں تمہیں تجربے کی بات بتاؤں۔“ وہ ہانپتا اور مسکراتا ہوا بولا ”چاہے وہ میڑھیاں ہوں یا ٹانگا پر تھک چڑھائی عیش تھا دیتی ہے“
وہ کچھ دیر موٹوں کے لان کے قریب میونہ اور بچوں کے ساتھ گفتگو کرتا رہا اور پھر ازانہل کے سارے آہستہ آہستہ اوپر چلا گیا۔ شاید اگلے برس یا اس سے اگلے برس وہ چوٹی جس پر پہنچ کر تم واپس نہیں آ سکتے۔

اور ہم خپلو جا رہے تھے۔

بلند راستے، خلیب میں پھیلا ہوا سندھ، بہت دور کبیشیر اور ان کے نیچے سرسبز وادیاں، آبشار جو طویل فاصلے کی وجہ سے رکے ہوئے لگتے تھے۔
ہم سندھ کو عبور کر کے دوسری طرف گئے اور دریائے شیوک کے ساتھ ساتھ سفر کرتے گئے۔

جھیل صدپارہ میں دو روزہ قیام کے بعد ہم سکرو لوٹے تو قلب علی کہنے لگے،
جناب اب کہاں جائیں گے؟ جہاں جائیں گے آپ میری پانچویں دیکن پر جائیں گے۔
نہیں نہیں آپ انکار کریں گے تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔ کسی کو دکھ دینا یوں بھی گناہ ہے اور اگر ہلستان کی سیر کے لئے پانچویں مل رہی ہو تو انکار بسر طور گناہ کبیرہ میں شامل ہو گا۔ چنانچہ ہم مرتکب نہ ہوئے۔ پانچویں کا ڈرائیور مست علی دیکھنے میں بھی مست لگا تھا لیکن اپنے کام میں اول نمبر تھا۔

پچھلی شب بالٹورو ریسٹ ہاؤس میں کرنل سکندر نے ایک پر تکلف کھانے کا بندوبست کیا۔ سیاحین سے واپس آنے والے چند نوجوان انہوں سے ملاقات ہوئی، ان کی آنکھوں میں ابھی تک وحشت اور فاصلے تھے، وہ ہر آہٹ پر چونک جاتے۔
جہاں آبادی آتی دیکن جو کے سنہرے کھیتوں میں سے گذرتی۔ کٹائی شروع تھی۔ کہیں تھریٹر نظر آ جاتے۔ تمام لوگ کھیتوں میں تھے۔ کہیں زوہ جو کی سنہری

بالیوں پر چل رہے تھے اور انہیں ”مگاہ“ رہے تھے اور ایک جگہ ہم نے چار خوبصورت گھوڑوں کو انہی بالیوں پر ایک دائرے میں دنگی چال چلتے دیکھا۔

ایک نوجوان لڑکی جو کے دانوں کو ایک ترنگی سے ہوا میں اچھال رہی تھی۔ سنہری بھوسہ اس کے چہرے پر گرنا تو کچھ دیر کے لیے بالکل دکھائی نہ دیتا کیونکہ اس کی رعنت بھی سنہری تھی۔ شاید اس لڑکی کی عمر بیس جتنی تھی۔ یعنی نے اسے حیرانی اور خوف سے دیکھا ”ابو یہ لڑکی اتنی چھوٹی سی ہے اور اتنا مشکل کام کر رہی ہے۔“
”اور یہ پڑھتی بھی ہوگی اور ماں کا ہاتھ بھی بٹاتی ہوگی۔ اور یعنی اگر آپ کے دادا جان مل کی ہتھی چھوڑ کر تعلیم حاصل نہ کرتے اور پھر شرم میں پوری زندگی رزق حلال کے لئے اتنی شدید جدوجہد نہ کرتے تو آج میں بھی کسی تیل کے پیچھے ”ہو ہو“ کر رہا ہوتا اور تم گندم کے دانوں کو ترنگی کی مدد سے ہوا میں اچھال رہی ہوتی۔ اس لڑکی کی طرح۔“

”میں لاہور واپس جا کر دادا جان کو ٹھیک یو کوں گی۔“ یعنی ہنسنے لگی۔
ہم ایک پل کے قریب سے گذرے۔ پل کے پار ایک راستہ کہیں جا رہا تھا۔ ہم سفر کرتے رہے۔ اور پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے اس پل کو پہلے کیسے دیکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے میں دو برس پہلے بھی اسی راستے سے خپلو گیا تھا اس لیے دیکھا تو ہو گا لیکن نہیں۔ اسے میں نے کسی اور طرح دیکھا تھا۔ یہ وہی پل تھا جس کے ساتھ ”ہوشے“ کلومیٹر کا سال خوردہ بورڈ لگا ہوا تھا۔ لیکن اس بار بورڈ وہاں نہیں تھا یا وہاں تھا لیکن میری نظروں سے اوجھل رہا۔ اور وہ راستہ ہوشے کو جا رہا تھا۔ اور سکرو سے روانگی کے وقت میں نے قلب علی کو کہا تھا کہ میں خپلو کے بعد ہوشے جانا چاہتا ہوں اور انہوں نے نہایت خوش ہو کر کہا تھا ہاں ہاں جائیں لیکن وہاں ٹھہرنے کے کہاں؟ چھوٹا سا پاڑی گاؤں ہے۔ میں ایک مرتبہ گیا تھا اور اپنے کسی دور کے رشتے دار کے پاس ٹھہرا تھا۔ لیکن ادھر پہلو بہت تھا، بہت کاٹا تھا۔ آپ جائیں لیکن اسی روز واپس آ جائیں۔

تو ہم سب خپلو جا رہے تھے۔ لیکن میں ہوشے جا رہا تھا۔ اور ہوشے کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ وہاں تک کا جیپ ٹریک کیا ہے؟ وہاں پہنچنے میں کتنا عرصہ لگتا ہے اور کیا مست علی اپنی مستی کے باوجود ہمیں وہاں تک لے جا سکتا ہے؟

یا قوت چریاں اس کے ٹھنڈے سبزے میں لپکتی رہتی ہیں۔
 میں سلجوق اور میر بیٹھک میں بیٹھے ہیں اور میز پر عزوق اور چیری کے تھال ہیں
 - راجہ محبوب علی خان بھی ہمیں ملنے کے لیے آگئے ہیں۔ وہ مجھ سے میرے والد
 چوہدری رحمت خان تارڑ کی صحت کے بارے میں پوچھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس
 محل میں جو بہت سارے پھول ہیں ان کے بیج انہوں نے ہماری فرم سے لگا کر بوئے
 تھے۔

میمونہ اور عینی زبان خانے میں زمرس ذکر کیا اور ان کی پھوپھی رانی سے محو گفتگو
 ہیں۔
 محل سے اترتے ہوئے بازار کے آغاز میں وہ مسجد ہے جس کے اندر جاکر قسم
 اٹھالینے والے پر کسی قسم کا شک نہیں کیا جاتا۔

بازار کے اوپر دیکھیں تو بلندی پر ایک سرسبز وادی نظر آتی ہے۔
 اور اوپر سے آنے والی ندی کے پل کے آس پاس اہل خیلو چھوٹی موٹی گپ
 شپ اور تفریح کے لیے آ بیٹھتے ہیں۔

بازار میں ہی خیلو کا ڈاکخانہ ہے۔ ہم نے اس کے اندر ایک بیچ پر بیٹھ کر
 لاہور خط لکھے۔ اور یہاں سے بھی صرف بلند پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ پوسٹ ماسٹر
 ایک نہایت محبت والے شخص جو ہمیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ ان کے پاس
 پوری وادی کے لیے صرف دو پوسٹ مین تھے۔ کچے فرش اور چھتری دیواروں والا
 چھوٹا سا والا نما ڈاک خانہ۔ اور اسے دیکھ کر سلجوق نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور
 کہنے لگا "ابو انسان کو خیلو کے اس ڈاکخانہ میں پوسٹ ماسٹر ہو جانا چاہئے بس۔"

اور وہاں واقعی ایک عجیب ٹھہراؤ تھا۔ پرانی میزوں، ٹوٹی ہوئی دو کرسیوں،
 الماریوں میں رکھے لفافوں اور خلط کے درمیان ایک عجیب ٹھہراؤ تھا اور پہاڑوں سے
 ٹھنڈک اس کے اندر تک آتی تھی۔

اور آخری شام میر افضل خان کی جانب سے خیلو کے ریسٹ ہاؤس میں ایک
 دعوت کا اہتمام تھا۔ میر صاحب اس خیلوی ڈنر کے لیے باقاعدہ ڈریس اپ ہو کر
 آئے یعنی نیلا بلیرز۔ گرے چلون اور سرخ رومال وغیرہ۔ ان کے ہمراہ شہری
 صاحب تھے جن کی نظریں صرف "صاحب" کے لیے تھیں۔ جب تک وہ نہ
 مسکراتے شہری صاحب بھی ہونٹ بھیج کر رکھتے۔ محکمہ زراعت کے ایک پارٹیشن افسر

ابھی شام ہونے کو تھی اور ہم خیلو پہنچ گئے۔
 یہاں شیوک کا پاٹ چوڑا ہو جاتا ہے اور اس کے پانی آپ کے ساتھ ساتھ بہنے
 لگتے ہیں۔ ریتے راستے پر شہتوت اور خوبائیاں اور ان پر آپ کی دیکھنے کے ساتھ۔
 خیلو کی وادی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ اس کا منظر صرف بلندی سے سامنے آتا ہے۔
 اسے دیکھنے کے لیے آپ کو اس کے اندر جانا پڑتا ہے اور بازار کی طرف پڑتا ہے۔
 خیلو کے اکلوتے ریسٹ ہاؤس میں ایک بہت بڑے اخروٹ کے درخت کے نیچے
 گھانچے سب ڈیرین کی پولیس ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ہمیں خوش آمدید کہنے کے
 لئے۔ ایس بی میر افضل خان پرانی فلوں کے کسی بیرو کی طرح خوش شکل اور ان
 کے ڈی ایس بی شہری صاحب۔ اگلے دو روز ہم پولیس کے زیر نگرانی رہے۔ اور
 بہت مزے میں رہے۔

خیلو پہلے بھی دل کو لگا تھا اب کے کچھ اور زور سے لگا بلکہ دل کے آس پاس
 کہیں مقیم ہو گیا۔ ہم بلندی پر جہاں برقیلے پانیوں کا شور بہت ہوتا ہے وہاں خانقاہ
 پہنچ دیکھنے کے لیے گئے۔ اور پھر وہیں سے اوپر ایک چراگاہ تک گئے جہاں سے
 وادی خیلو اور دریائے شیوک قدموں میں بھیجے نظر آتے ہیں اور سامنے پہاڑوں پر
 پچھلی رات کی تازہ برف دھوپ میں پکھلتی ہے۔

اس بار میں نے پہلی بار خیلو کے ایک پرانے محلے میں قدیم وضع کے پتھرے
 مکانوں اور عمارتوں کے قریب خانقاہ معلیٰ کو دیکھا۔ یعنی اور میر اس کے دیویدیکل
 بلند ستونوں کو بانسوں میں لینے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ دونوں اس قدیم عبادت گاہ
 میں لٹل پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو گویا بے شمار ستونوں کے درمیان وہ بھی دو
 منکوب مگر چھوٹے چھوٹے ستون تھے۔

خیلو کے راجاؤں کے محل کے خشک باغ میں سیب سرخ تو ہو چکے تھے لیکن
 ابھی پکنے میں کچھ دیر تھی اور چیری کے دونوں درختوں میں آخری دنوں کے پھل
 تھے۔ جتنے کے کنارے راجہ ذکر کیا کا پولو کا گھوڑا ہمیں حیرت اور خشک سے دیکھ کر
 بدن قرار دیتا تھا۔ میرے دل کے آس پاس جہاں کہیں خیلو مقیم ہے وہاں جو سرسبز
 خشک نموں اور گلاب کے جنگلی پھولوں والا ٹکڑا ہے وہ اسی محل کے باغ کا ایک حصہ
 ہے۔ دو ملازم چیری کے درختوں پر چڑھ کر انہیں اس طرح ہلاتے ہیں جیسے ہم بیری
 کے درخت کو جھجھوڑ کر بیر گراتے ہیں۔ یہاں گھاس کو پانی دیا ہوا ہے اور سرخ

ہے۔ کسی مجرم کو دیکھنے کے لیے ہمیں بلتستان سے باہر جانا پڑتا ہے۔ یہاں ایک پولیس افسر آئے تو انہیں ایک مقام کے بارے میں بتایا گیا کہ اسے قتل گاہ کہتے ہیں۔ ایک اور جگہ دکھائی اور بتایا کہ اس کا نام بھی قتل گاہ ہے۔ پولیس افسر بھنا کر بولے: اوئے قتل و قتل کسی کو کرتے نہیں ہو اور جگہ کا نام قتل گاہ رکھ دیا ہے۔ سکرو جیل کی یہ حالت ہے کہ قیدیوں کی نسبت شاف زیادہ ہے۔ تارڑ صاحب پولیس والوں کے مورال کے لیے بہت برا علاقہ ہے یہ۔ ”بھلی چلی گئی“ ریسٹ ہاؤس سے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ شیوک کے پانیوں کی سرسراہٹ بے حد مدھم تھی۔ البتہ شہری ڈاکٹر سٹورٹ کے مکان کی کھڑکیوں میں روشنی تھی کیونکہ اس نے چھت پر شہی توانائی کا ایک پونٹ نصب کر رکھا تھا۔

میں ایک بار پھر کمروں کا کہ خپلو میرے دل کے آس پاس کہیں مقیم ہو گیا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اوپر خپلو کی ڈھلوانوں پر تھوڑی سی زمین ہو جس میں ایک مخصوص بلٹی طرز کا مٹی اور گھڑی کا مکان تعمیر کیا جائے جس کی کھڑکیاں چھوٹی اور چھتیں شہریوں والی اور نیچی ہوں اور ان میں آتش دان ہوں۔ اور خوبانی کے دو درخت ہوں، ایک سیب کا اور ایک چری کا۔ کچھ سبزیاں اور اوپر سے آتی بریلی پانی کی ایک ٹالی شور مچاتی اس زمین میں سے گزرے۔ اور اس مکان میں بیٹھ کر انسان کتابیں پڑھے اور وہ تمام ناول اور افسانے لکھے جو اس نے لکھنے ہیں۔ اور اسے اپنی روزی کے لیے فضول قسم کے مضامین اور کالم نہ لکھنے پڑیں اور ٹیلی ویژن پر کام نہ کرنا پڑے۔ کیا یہ ممکن ہے۔ نہیں یہ ممکن نہیں کیونکہ خپلو میرے دل میں مقیم ہو سکتا ہے لیکن میں خپلو میں مقیم نہیں ہو سکتا۔ اور اگلی سویر ہم نے ہوشے جانا تھا۔

خپلو ریسٹ ہاؤس سے اترتے راستے کے کنارے سیڑیوں کے چار پانچ درخت پھل سے لدے ہوئے تھے، ان کے نیچے سفید سیب بچوں کی گمشدہ گیندوں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔ مست علی نے ایک سیب اٹھا کر اسے غور سے دیکھا اور واپس پھینک دیا ”ابھی کچے ہیں صاحب۔“

میں مست علی کے بارے میں تھوڑا فکر مند تھا۔ قلب علی صاحب نے بتایا تھا کہ ڈرائیور بہت اچھا ہے لیکن صرف یہ ہے کہ قدرے برا ہے بلکہ برا تو نہیں ذرا کم سنتا ہے اور جب کم سنتا ہے تو مسکراتا ہے اور شاید اسی لیے مست علی ہر وقت

امان اللہ خان بھی تشریف لائے۔ وہ بھی والد صاحب کو جانتے تھے اور گواہ لٹری کی کشمیری چائے کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے۔ راجہ خپلو کے محل کے اوپر ایک سرسبز ڈھلوان جو نظر آتی ہے اس کا تذکرہ ہوا تو امان صاحب کہنے لگے ”وہاں تو میرا آلو ہے۔“

”آپ کا آلو ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں تارڑ صاحب۔ آپ کبھی میرا آلو دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔ میں آج بھی اپنا آلو دیکھ کر آیا ہوں۔ بلتستان میں اور کس کا آلو ہے؟ صرف میرا آلو ہے اور کیا آلو ہے۔ اور ایسا آلو ہے کہ۔۔۔“ امان صاحب نے بلتستان میں آلو کی ایک نئی قسم متعارف کروائی تھی جسے وہ بڑے فخر سے ”میرا آلو“ کہتے تھے۔

”تو کل صبح آپ سکرو واپس جائیں گے؟“ میر صاحب نے چائے کے بعد دریافت کیا۔

”کل صبح ہم ہوشے جائیں گے۔“

”ہوشے؟“ میر صاحب نے ذرا تعقیبی انداز کی سختی سے کہا ”وہاں کیا کریں گے جا کر؟“

”یہ تو وہاں جا کر پتہ چلے گا۔“ ویسے آپ ہوشے گئے ہیں؟“

”میں؟“ میر صاحب کھانے ”ہے تو میرے علاقے میں۔ کیوں بھی شہری ہم ہوشے تو نہیں گئے؟“

”نہیں جی۔“ شہری صاحب فوراً کھڑے ہو گئے۔

”کیوں شہری وہاں تک کا راستہ کیا ہے؟“

”پتہ نہیں سر۔ ٹھیک ہو گا سر۔ میں کسی سے پتہ کروں گا سر۔“

”آپ شہری کو ساتھ لے جائیں۔“ میر صاحب بولے ”یہ آپ کا مناسب بندوبست کر دے گا۔“

”آپ فکر نہ کریں ہم پولیس کی حفاظت کے بغیر بھی پہنچ جائیں گے۔ یوں بھی خپلو میں شہری صاحب کی ضرورت ہوگی۔“

میر صاحب نے ایک گہری گونج والا قہقہہ لگایا ”تارڑ صاحب یہاں تو سرے سے پولیس کی ہی ضرورت نہیں۔ کرائم ریسٹ ڈیو ہے۔ بہت شریف لوگ ہیں۔ پولیس تو یہاں اگلیاں چٹکتی رہتی ہے یا پھر سوشل ویلفیئر کے کاموں میں مصروف رہتی

مسکراتا رہتا تھا اور ہم سمجھتے تھے کہ مست الٹ ہے اس لیے مسکراتا ہے اور میں فکر مند اس لیے تھا کہ وہ بھی آج تک ہوشے نہیں گیا تھا اور ہوشے کے راستے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

ہم خپلو سے صبح چھ بجے نکلے ایک غیر محتاط اندازے کے مطابق ہمیں تین سے چار گھنٹے کے اندر ہوشے پہنچنا چاہئے تھا۔

ہم ابھی سیاحین جانے والی سڑک پر شیوک کے کنارے سورمو کی جانب جا رہے تھے۔

سورمو کے قریب دریا اور پھل گیا۔ اور دریا کے خشک ریتے جزیروں سے پرے جو خشک پہاڑ تھے ان کے سنگم پر صاف نیلے شفاف آسمان میں شہر برآمد دکھائی دینے لگی۔ وہ حیرت انگیز حد تک سوئٹزرلینڈ کی بلند ترین چوٹی میٹربارن سے مشابہ تھی بلکہ یہ کتنا زیادہ درست ہو گا کہ میٹربارن شہر برآمد سے مشابہ تھی کیونکہ یہ اس کی نسبت کہیں بلند تھی۔

میں بچوں سے مخاطب ہوا "ہمیں وہاں جانا ہے۔"

"کہاں؟ شہر برآمد پر؟" یعنی نے چونک کر کہا۔

"اس کے عین نیچے ہوشے کا گاؤں ہے وہاں۔ ابھی ہم دریا پار کریں گے اور سیدھے اس چوٹی کی جانب سفر کرنے لگیں گے۔"

مست علی نے پانچو روک دی۔

وہ صرف مسکرایا اور نیچے اتر گیا۔ اس نے چاروں ٹائروں کو زور دار ٹھنڈے رسید کئے اور پھر پچھلے ہار کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نیچے اتر کر اس کے پاس چلا گیا۔

"کیا ہوا؟"

اس نے مجھے ایک زور دار مسکراہٹ سے نوازا اور مشین نکال کر پچھر شدہ ہار بدلنے لگا۔ نیچے بھی باہر آ گئے اور کسی دیران جزیروں میں کشتی پر پہنچنے والے مسافروں کی طرح ادھر ادھر گھومنے لگے۔ کیا ہم مشین کے بغیر ہوشے تک سفر کرنے کا خطرہ مول لے سکتے تھے؟ اگر ہم خپلو واپس جا کر پچھر گلوآتے تھے تو ہم اتنا وقت ضائع کر دیتے تھے کہ ہوشے نہیں جاسکتے تھے۔

"پھر مست علی؟ اب کیا ہو گا؟" میں نے ذرا بلند آواز میں پوچھا۔

اس نے مسکراتا ہوا کر دیا "کچھ نہیں ہو گا صاحب، اللہ مالک ہے۔ ہم ہوشے

جائیں گے۔"

میں نے بھی سوچا کہ اگر خدا نخواستہ اس پہاڑی سفر کے دوران ایک اور ہار پچھر ہو جاتا ہے تو ہم پانچو میں شب بسر کر سکتے تھے کیونکہ خوراک ہمارے پاس تھی اور علاقہ بھی محفوظ تھا۔ اور اسی دوران مست علی پچھر شدہ ہار گھلے میں ڈال کر خپلو یا سکرو تک ٹریکنگ کرتا ہوا جاسکتا تھا اور دو چار دن کے اندر اندر پچھر گلو کر واپس آ سکتا تھا۔ نوپر اہل۔

ہم سورمو میں سے گذر گئے۔ ابھی بہت کم لوگ بیدار ہوئے تھے۔

سورمو سے آگے چند لوگ سڑک کے کنارے بٹکے ہوئے تھے۔ نیچے ایک خطرناک ڈھلوان پر ایک ٹرک اونڈھا پڑا تھا۔ معلوم ہوا پچھلی شب نیچے گیا تھا اور ڈرائیور کا کچھ پتہ نہیں۔ بچوں نے اسے بے حد دلچسپی سے دیکھا اور میں نے بچوں کو بے حد خوف سے دیکھا۔ راستے کی خطرناکی ایک سرد لہر کی طرح میری ریڑھ کی ہڈی میں اترنے لگی۔

راستہ چٹان کے ساتھ چٹنے لگا اور دریا نیچے چلا گیا۔ جیب کا بانٹ اونچا ہونے لگا اور ہموار ہوا اور نیچے دریا پر ایک پل نظر آیا "یہ سورمو پل ہے ہم اس کے پار جائیں گے۔" مست علی نے یہ الفاظ کہے اور پھر یکدم سڑک چھوڑ کر جدھر کھائی تھی ادھر شیرنگ گھما دیا۔ اور تب اس لمحے میرا دل رکا کیونکہ آگے کچھ بھی نہ تھا۔ یہ لمحہ شاید ایک سیکنڈ کا تھا یا اس سے ذرا طویل لیکن مجھ پر جیسے گذرا وہ میں جانتا ہوں یا وہ محض جانتا ہو گا جس کی جیب ایک پہاڑی راستے پر چلتے چلتے یکدم ہوا میں جاتی ہے اور پھر گمراہی میں جاتی ہے۔ باوی انظر میں سڑک چٹان کے ساتھ جا رہی تھی اور ہمیں بھی اس پر رہنا چاہئے تھا لیکن مست علی شیرنگ گھما چکا تھا۔ اس ایک لمحے میں میرے آگے صرف آسمان تھا اور نیچے گمراہی تھی اور جیب ہوا میں تھی۔ اور پھر اس سے اگلے لمحے۔ جیب نیچے ہوئی اور اس کے اگلے ہار ایک ایسے ڈھلوان کے کپے راستے پر جا گئے جو سڑک پر سے بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ ہم نیچے اترے اور پل کے پار چلے گئے۔ چیک پوسٹ پر میرا فضل کا فون آچکا تھا اس لیے ہمیں دوسری طرف جانے دیا گیا۔ وہ راستہ جسے ہم نے چھوڑا تھا سیاحین کے پڑاؤ دم سم اور گومو کی طرف جاتا تھا اور یہ راستہ۔۔۔ ہوشے کی طرف جانا چاہئے تھا۔ شیوک کے دوسری جانب پہنچ کر میں نے مست علی سے کہا "جیب تھوڑی دیر کے لیے روکو مجھے ایک گھونٹ پانی دو اور

آئندہ پانچو کو اس طرح یکدم کسی ایسے راستے پر نہ موڑنا جو مجھے نظر نہ آتا ہو۔
مست علی مسکراتے لگا۔

سور موہل سے پرے راستہ ذرا بہتر ہوا، قدرے محدود ہوا اور ہم اس پر تھما
سفر کرتے تھے اور حکمت کم تھے اور ہر ماہل زیادہ نہ تھی۔ ہم دریائے شیوک کے اس
جانب آچکے تھے۔ راستہ ذرا بلند ہوا اور پھر ایک دور ابا دکھائی دیا۔ ایک راستہ نیچے
ایک خامے بڑے گاؤں کو جا رہا تھا۔

”کدھر صاحب!“ مست علی مسکرایا۔

”مجھے کیا پتہ کدھر صاحب۔ میرا خیال ہے ہمیں سیدھا جانا ہے۔“

گاؤں میں اترتے راستے کو چھوڑ کر ہم سیدھے چلے گئے۔ لیکن بہت کم مدت
کے لئے ہم سیدھے رہے اور پھر ایک دو مرتبہ اٹے ہوتے ہیچے کیونکہ سڑک پر جا بجا
پتھر اور ٹکڑے تھے اور کہیں کہیں گڑھے بھی تھے۔ مست علی نے پانچو روک دی اور
مسکراتے بغیر سڑک کو غور سے دیکھا اور پھر مجھے غور سے دیکھا اور کہنے لگا ”یہ راستہ
ختم ہو چکا ہے اس پر جیپ وغیرہ کئی مہینے سے نہیں چلا۔“

”اس کا مطلب ہے ہم ہوشے نہیں جاسکتے؟“

مست علی مسکرایا اور پھر سڑک کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ نیچے گاؤں میں صبح ہو
ری تھی اور ایک نوجوان لڑکی چھت پر خوبائیاں پھیلا رہی تھی۔ مست علی نے منہ پر
ہاتھ رکھ کر اسے پکارا۔ آواز اس تک پہنچی لیکن وہ جان نہ سکی کہ یہ کدھر سے آئی
ہے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن ہماری جانب اوپر نہیں دیکھا اور پھر سے
خوبائیاں پھیلانے لگی۔ مست علی نے ایک مرتبہ پھر ”ہو ہو“ کیا اور اس لڑکی نے اوپر
ہماری جانب دیکھا۔ یقیناً پہلی نظر میں اسے سلیٹی رنگ کے پہاڑی دکھائی دیئے ہوں
گے کیونکہ وہ ہم سے خامے فاصلے پر تھی اور پھر اسے ایک چھوٹی سی جیپ اور اس
کے مسافر دکھائی دیئے ہوں گے۔ مست علی نے شاید ہوشے کے راستے کے بارے
میں پوچھا اور وہ نیچے چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں ایک مقامی کسان ہماری جانب آ رہا تھا۔
وہ سڑک کے مین ہیچے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور مست علی اس سے باتیں کرنے لگا۔
معلوم ہوا کہ اوپر والی سڑک ایک عرصے سے متروک ہو چکی ہے اور ہوشے کے لئے
گاؤں کے پار جا کر دوسرے راستے پر چلنا ہو گا۔

”اس سے پوچھو اس گاؤں کا نام کیا ہے؟“

مست علی نے پوچھا اور یہ بالے گن تھا۔

پانچو نیچے اتری اور گاؤں میں آگئی، کچھتوں اور آب پاشی کی ٹالیوں کو روئتی
پانچو کے انجن کی آواز بالے گن کی صبح میں بے حد بد صورت تھی۔

گاؤں کے اختتام پر ایک بڑا ٹالہ تھا۔ جو ہوشے سے آ رہا تھا۔ اس پر ایک
محل پہل تھا جسے ہم نے عبور کیا اور دوسری جانب چلے گئے۔
اب ہمیں مٹ برم کی طرف سفر کرنا تھا۔

یہاں راستہ تھوڑی دور تک راستہ رہا اور پھر چٹانوں کا ڈھیر ہو گیا۔ سینکڑوں
بڑے بڑے پتھر اور انہی پتھروں پر چل کر اگر آسکو تو آؤ۔ جیپ تقریباً بے قابو ہو رہی
تھی اور مست علی بڑی مشکل سے سٹیئرنگ کو سنبھال رہا تھا جو کہ ہاتھ سے چھوٹا جاتا
تھا۔ انجن اور پاؤں سے کشت و ریمت کے نئے پھوٹ رہے تھے اور یہ نئے خوفزدہ
کرتے تھے کہ اگر اس جیپ میں یہاں کسی قسم کی فنی خرابی ظہور پذیر ہو گئی تو ہم کیا
کریں گے۔ جیپ جو بے اختیار ہو کر جھٹکے مارتی اچھلتی تھی اسی ردھم میں ہم سب کی
پٹلیاں بھی جھٹکے کھاتیں ایک دوسرے میں الجھتی جا رہی تھیں۔ جب راستے کا یہ پتھر
پتھر کھڑا ختم ہوا تو مست علی نے جیپ روک کر ماتھے سے پسینہ پونچھا۔

”مست علی کیا تم کبھی اتنے خراب راستے پر اس پانچو کو لائے ہو؟“

”نہیں صاحب۔“

”اور کیا یہ پانچو ایسے راستے پر چلنے کے قائل ہے؟“

”نہیں صاحب۔“

”اب اگر کوئی اور کھڑا اسی نوعیت کا ہمارے راستے میں آیا تو ہم واپس ہو
جائیں گے۔“

”جی صاحب۔“

تقریباً ایک فرلانگ کے کچے اور بہتر راستے کے بعد اسی نوعیت کا ایک اور پتھر
پتھر راستہ ہمارے سامنے تھا۔

”کیا کریں صاحب؟“ مست علی بولا۔ اور کہنا وہ یہی چاہتا تھا کہ اب واپس چلیں
صاحب؟

”کیا خیال ہے؟“ میں نے موٹا سے مشورہ کیا ”جیپ ان پتھروں پر چلی جائے
گی۔“

”چلی تو جائے گی لیکن۔۔۔ ٹوٹ نہ جائے۔“

ہم سب نیچے اترنے لگے تو مست علی نے روک لیا ”اگر آگے جانا ہے تو بیٹھے

رہو۔ جیب خالی ہوگی تو زیادہ اچھے گی۔

ہم پھر سے براجمان ہو گئے اور جیب اور سینرنگ اور مست علی اور ہم سب پھر سے بے اختیار ہو گئے اور ہم بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں زبان دانتوں تلے آکر کٹ نہ جائے اور اس کے باوجود میمونہ کہنے لگی ”اگر قلب علی اس وقت اپنی پیاری پانچو کو یوں جھٹکے دار ڈانس کرتے دیکھ لیں تو وہ قلب ساکن ہو جائیں۔“ یہ آزمائش جب اختتام کو پہنچی تو ہم نے جیب سے باہر نکل کر اپنی ہڈیوں اور جڑوں کو سمجھ جان کر ان کے اصل مقام پر بٹھایا۔

اور پھر ہم نے دیکھا کہ یہاں سے شہریم زیادہ صاف نظر آتی تھی اور ہم اپنی یہ چھوٹی سی کلفت بھول گئے۔ اب یہ بلند برقانی چوٹی ہماری دینڈ ٹیڈ کے ایک حصے میں ایک تصویر کی طرح آویزاں ہو گئی، یہاں سے ہوشے تک اسے مسلسل نظر آتے رہتا تھا۔ سفر پھر سے شروع ہو گیا۔ ایک بہت وسیع سرسبز ڈھلوان تھی جس پر دو پگڈنڈیاں تھیں اور ان پر جیب کے باز تھے اور ان کے درمیان گھاس تھی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ اور اس ڈھلوان پر لمبی لمبی قد آدم گھاس لہراتی تھی اور اس گھاس میں کہیں کہیں بڑے پتھر جو آرائشی لگتے تھے۔ خاصے فاصلے پر نیچے ہوشے کا پالا تھا اور اس کے پار ٹیکسی ٹوکیلی برفوں سے اتنی چٹانیں تھیں اور ان میں کہیں کوئی وادی تھی جہاں لوگ تھے۔ جو شاید اپنے گھروں سے ہمیں دیکھتے تھے لیکن ہم انہیں یا ان کے گھروں کو یہاں سے نہیں دیکھ سکتے تھے، صرف چٹانوں کے نیچے بڑے کی ایک لکیر نظر آتی تھی جہاں کوئی وادی تھی۔ راستہ یہاں تقریباً ہموار تھا۔ اوپر سے کوئی چشمہ اگر راستے میں آجاتا تو ہم جیب روک کر اپنے آپ کو تروتازہ کر لیتے۔

اس وسیع ڈھلوان پر سفر کرتے ہوئے ایک کیفیت تھی جو مسلسل تھی اور اس کیفیت میں جب جیب کا انجن بند ہوتا تو ایک مکمل تھلائی ہوتی، سرسراتی بلند گھاس کی خاموشی ہوتی اور ہم باتیں کرتے تو ہماری آواز ہمیں بھی سنائی دیتی۔ تقریباً تمام پہاڑی راستے دریاؤں اور ٹالوں کے ساتھ چلتے ہیں اس لیے وہاں پانی کا شور بھی ساتھ چلتا ہے لیکن ہوشے روڈ کا یہ حصہ مختلف تھا۔ ٹالہ بہت دور نیچے تھا اور ہم اوپر بلندی پر سرسراتی گھاس اور پھولوں میں تھے۔ ہوشے کے لیے سکرو یا خیلو سے باقاعدہ جیب سروس نہیں ہے۔ صرف کارگو جیپیں سالانہ سے لدی اپنی من مرضی سے چلتی ہیں اور وہ دن میں دو چار چلتی ہوں گی کہ راستے پر گھاس اسی لیے اکی ہوئی تھی کہ ہمارے مسلسل سلتے نہیں۔

ایک خوف یہ بھی دل میں تھا کہ ابھی ہم نے ہوشے پہنچا ہے۔ وہاں تھوڑی دیر کے لیے رک کر پھر اسی راستے سے نیچے ہالے گون تک آنا ہے اور پھر شیوک کے اسی کنارے پر سفر کرتے ہوئے کیڑوں اور مچلوں کے راستے سکرو پہنچنا ہے اور تاریکی سے چھتر پہنچنا ہے۔

سرسبز ڈھلوان کی جگہ خشک پہاڑیاں نظر آنے لگیں۔ راستہ سمندری لہروں کی طرح اوپر نیچے ہونے لگا اور بہت خطرناک انداز میں ہونے لگا۔

ہم نے پہلی بار اس راستے پر دو جیپوں کو دیکھا جن کے مسافر کولہوں پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے اور وہ غیر ملکی کوہ نور یا ٹریک تھے۔ ایک جیب کا ڈرائیور اس کے نیچے گھسا ہوا تھا۔ ابھی ہم کچھ فاصلے پر تھے کہ ایک خاتون نے دیوانہ وار ہاتھ ہلا کر روک لیا حالانکہ وہ ہاتھ نہ بھی ہلاتی تو لوگ رک جاتے۔ جین اور کھلی شرٹ اور سر پر اس نے دوپٹہ سالیٹا ہوا اور اس نے کھڑکی میں سے سر اندر کیا اور مست علی سے کہنے لگی اور اس خوبصورت نرمی سے کہنے لگی جو فرانسیسی لمبے میں انگریزی بولنے سے آتی ہے یعنی ایک سازش بھری جنسی سرگوشی کے انداز میں کہ ہماری جیب خراب ہو چکی ہے اس لیے تھوڑی دیر کے لیے پلیز ادھر رک جائیے کیونکہ راستہ تنگ ہے اور راستے میں ہماری جیب ہے اور پلیز آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے۔ مست علی حسب معمول مسکراتا رہا لیکن کچھ بہ انداز دگر مسکراتا رہا اور میں اسے دیکھتا رہا اور وہ واقعی بے حد خوبصورت تھی اور پر کشش بھوپن اس کے چہرے پر تھا۔ خاصی دیر کے بعد اسے احساس ہوا کہ مست علی صاحب اس کی بات نہیں سمجھ رہے۔ تب اس نے مجھ سے رجوع کیا۔ اور شاید میں بھی اسی طرح مسکراتے لگا جیسے مست علی مسکرا رہا تھا اور پھر مجھے محسوس ہوا کہ مونہ لے بھی بہ انداز دگر مجھے گھورا ہے اور تب میں نے اس بی بی سے عرض کیا کہ جی۔۔۔ ہم مائنڈ کرنے والے کون ہوتے ہیں اور ہم یہیں رک جائیں گے۔ بد قسمتی سے ان لوگوں کی جیب فوراً ہی درست ہو گئی اور ہمیں ان کے قریب سے گزرنے کا راستہ مل گیا۔ رنگ برنگ رک سیک اور نیلے ڈرم جن میں کوہ پنا اپنا سالانہ پیک کر کے ان پر نمبر لگا دیتے ہیں۔ اور اس سالانہ میں وہ جو حشر سالانہ تھے۔

کے ٹو موٹل سکرو میں پہنچنے والے بیشتر ٹریک ہوشے ہوشے کرتے پھرتے ہیں کیونکہ ادھر ہوشے سے پرے بلتستان کے چند بہترین اور خوبصورت ترین ٹریکس یا راستے ہیں۔ گنڈالو کی چوٹی کو بھی یہیں سے راستہ جاتا ہے اور اس پر پلوش چوٹی کو سر

کرنا ادا آسان ہے کہ اس کے اوپر اکثر ٹریک جیم ہو جاتا ہے اور اوپر آنے والے چوٹی پر براجمان کوہ پناؤں سے درخواست کرتے ہیں کہ براہ کرم ذرا جگہ خالی کر دیں تاکہ ہم بھی تاریخ میں نام لکھوا لیں کیونکہ ہمارے پیچھے ایک اور نیم چلی آ رہی ہے۔ ہوشے کا نالہ پرے ہو گیا اور اس کا شور بھی کم ہو گیا۔ پھر ایک زبردست چڑھائی آئی اور اس کے ساتھ چشموں کے چلنے کا شور آیا۔ جب ہم اوپر پہنچے تو پہاڑوں میں گھرے جو کے سرسبز کھیت دکھائی دیئے۔ ان کھیتوں کے آغاز میں چند پتھرے مکان تھے اور ان کے سامنے کسی ایسے قبیلے کے لوگ تھے جو پتھر کے زمانے کا تھا۔ ہم پہاڑوں سے اترے تو ابھی کانوں میں سڑکی گونج سفر میں تھی۔ تاریک کوٹھڑیوں کے سامنے خشک دھول آلود دھوپ سے روشن راستے پر ہوشے کے باسی زندگی کے کاموں میں مصروف تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھا تو ہم سے ذرا پرے ہوئے۔ ذرا ٹھکے جیسے کوئی معصوم جانور خطرناک انسان کو دیکھ کر ٹھٹھکا ہے۔ ان کے چہرے اور ہاتھ سیاہ تھے اور یہ اس دھوئیں کی سیاہی تھی جو ان کی بند کوٹھڑیوں میں پھیلتا ہے اور وہ شدید سردی سے بچاؤ کے لئے ناکانی آگ پر بجھے موسم سرما گزارتے ہیں۔ ان کے سروں پر قدیم وضع کی ادنیٰ بلٹی ٹوپیاں تھیں۔ وہ بوڑھی عورتیں ٹاٹ میں لپیٹی ہوئی بے دانت مسکراہٹوں سے ہمیں دیکھتی تھیں اور شاید پچھلے برس کی جو کی فصل کو چھانچوں میں اچھال کر اسے صاف کرتی تھیں۔ میں نے ان کے قریب ہونے کی کوشش کی لیکن وہ ”اگریرز۔ اگریرز“ کہتی ہوئیں کوٹھڑیوں میں کھس گئیں۔ ہوشے ایک ایسا پڑاؤ ہے جہاں پاکستانی کم ہی آتے ہیں اور بعد میں مست علی نے بتایا کہ میمونہ اور یعنی شامہ باہر کی دنیا کی پہلی خواتین تھیں جو انہوں نے دیکھیں اور باہر کی دنیا سے مراد پاکستان کے وہ حصے ہیں جہاں سے ہم آئے تھے۔ چنانچہ ان کے ”اگریرز۔ اگریرز“ کہنے پر میمونہ بیگم بے حد سچ پا ہوئیں کہ ہم مسلمانوں کو مونے اگریریوں سے ملا رہے ہیں۔ اس نے ایک بڑی اماں کا کندھا پکڑ کر خوب زور سے بلایا اور کہنے لگی ”ہم پاکستانی ہیں۔ مسلمان۔ مسلمان۔ تم کیا ہو؟“

بڑی اماں نے بے چینی سے میمونہ کو دیکھا اور اس کی آنکھیں عمر اور موسموں کی شدت سے سرخ دلدل میں بدل چکی تھیں اور پھر اس نے ناک صاف کرتے ہوئے کہا ”مسلمان۔“ اس پر میمونہ نے اپنی مسلمانی مکمل طور پر تسلی بخش کرنے کے لیے کلمہ سنایا اور آیت الکرسی کا ورد کیا۔ بس یہ وہ ظلم تھا جس نے ہوشے کے تمام دروازے ہم پر کھول دیئے۔ سب لوگ بے دھڑک ہمارے پاس آنے لگے بچے

ہمارے گرد ہو گئے نوجوان لڑکیاں دروازوں کی اوٹ سے ہمیں دیکھنے لگیں اور چند بزرگوں نے آگے بڑھ کر ہم سے ہاتھ ملایا۔ جیسے ہم ان کے رشتے دار تھے۔ اور ہم ان کے رشتے تھے۔

شمل میں کھیتوں کے عجیب منظر بننے ہیں۔ داوی فیلو اور دریائے شیوک کے کنارے جو کی فصل کٹ چکی ہے اور اس کی چھڑائی جاری ہے، ہوا میں سنہری جھکے اڑتے ہیں۔ ذرا بلندی پر آجائیں تو جو اگرچہ پک چکا ہے لیکن ابھی کٹائی ہو رہی ہے اور یہاں ہوشے میں یہی فصل ابھی سرسبز تھی اور یہاں کے کھیتیں دعا کرتے تھے کہ جلدی سے یہ پک جائے ورنہ سردیوں کا آغاز ہو گیا تو فصل ضائع چلی جائے گی اور ایسا کئی بار ہو جاتا ہے کہ گرمیاں اتنی مختصر ہوتی ہیں کہ خوشے ہرے ہی رہتے ہیں اور دانے بچتے نہیں۔

”ش برم ان“ ہوشے کا پہلا ہوٹل ہے۔ چار کمرے ایک ڈرائنگ روم اور دیگر ضروریات کے لیے ہوشے کے کھیت۔ چاروں کمرے مقتل تھے کیونکہ ان میں قیام پذیر غیر ملکی کوہ نور اور گئے ہوئے تھے۔ ڈرائنگ روم میں شیل کا فرنیچر تھا جو با آسانی نیچے سے اوپر یہاں تک ٹرانسپورٹ ہو جاتا ہے۔ دیواروں پر بے شمار تصاویر تھیں۔ ان میں روز علی بھی تھا جو میسر کے ساتھ یورپ گیا تھا۔ یورپ کے بڑے شہروں میں ہوشے کا روز علی کھڑا مسکراتا تھا، کبھی میسر کے ہمراہ اور کبھی کسی حسین کوہ پنا خانوں کے ساتھ۔ جس کی آنکھیں کھتی تھیں کہ اگر کوہ نہ ہوں تو پھر بھی پنائی تو کتنی ہے۔ یہ ہوٹل روز علی کی ملکیت تھا۔ اور یہاں ہم نے بہترین چائے پیا۔

ہوشے کو بین الاقوامی شہرت اس کے سب سے چھوٹے باسی ”شل کریم“ نے دی۔ ”شل کریم“ کو شل کریم اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ حقیقتاً شل ہے۔ یعنی تقریباً ۵ فٹ ۲ انچ کی قامت کا ایک ایسا پورٹر جس کی جرات اور قوت برداشت داستانوں کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ کچھ عرصہ چھتر فرانسیسی ٹیلی ویژن نے اس کی زندگی پر ایک فلم تیار کی۔ لوگ اسے خصوصی طور پر دیکھنے جاتے ہیں اور غیر ملکی کوہ پناٹیوں کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ شل کریم کو اپنی ٹیم میں شامل کر سکیں۔

”شل کریم کہاں ہے؟“ ہم نے ش برم ان کے دہتر سے پوچھا۔

”وہ اوپر گیا ہے“ اس نے جواب دیا۔

ایک تازہ تازہ صاف ستھرا ہو کر آنے والا نوجوان، لباس، لہنی مارکیٹ میں

مزگشت کرنے والے نوجوانوں ایسا 'ہل بنے ہوئے اور بڑی احتیاط سے چلتا میرے پاس آیا اور بڑی بے اعتنائی سے بولا "آپ لاہور میں گلبرگ کی فردوس مارکیٹ کے قریب رہتے ہیں ناں؟ میں نے آپ کو وہاں دیکھا ہے۔ میں بھی وہیں اپنے بھائی کے پاس رہتا ہوں اور انگلش میڈیم سکول میں پڑھتا ہوں۔"

جا حیرا ستیا ناس ہو جائے۔ میں نے دانت پیچتے ہوئے زیر لب کہا۔ اس نوجوان نے اس بلند اور دشوار راستے والی غیر معروف وادی کے سارے رومان کو جاہ کر دیا تھا۔ یعنی ہم بقول کسے مارو مار کرتے ہوئے جا پہنچتے ہیں اور وہاں ہمیں لاہور کے ہمسائے مل جاتے ہیں۔ بہر حال میں نے اس نوجوان کا دل رکھنے کی خاطر اس کے لباس کی تعریف کی اور رخصت کر دیا۔ ہم گاؤں سے نکل کر تھوڑی دور تک ان پگڈنڈیوں پر گئے جو اوپر جاتی تھیں۔ کھیت میں کام کرنے والی ایک عورت میوند سے باتیں کرنے لگی "میرا رنگ بھی تمہارے جیسا ہے۔ میرے پاس صابن ہوتا تو میں بھی منہ ہاتھ دھوتی۔ نیچے سے آئی ہو؟ سنا ہے سکروو بہت بڑا شہر ہے۔ نہیں میں تو کبھی ہوٹے سے نیچے نہیں گئی ہاں اوپر جاتی ہوں گھاس کاٹنے کے لیے۔" یہ تینوں بچے ہمارے ہیں؟ اتنے بڑے بڑے ہو گئے ہیں تو ان کا شادی کیوں نہیں بنایا۔؟"

بلتستان میں نہایت کم عمری میں شادی کر دی جاتی ہے اور بلیٹیوں کے لیے یہ بات باعث حیرت تھی کہ اتنے بڑے بڑے بچوں کی ابھی شادی کیوں نہیں بنائی۔۔۔ بھلا پہلے ماں باپ تو شادی اچھی طرح بنالیں پھر بچوں کو بھی دیکھا جائے گا۔

ہوٹے روایتی معنوں میں ایک خوبصورت گاؤں نہیں ہے۔

پتھروں کی چند دیواریں 'کوٹھڑیاں' ایک ہوٹل 'دو دوکانیں جو بند رہتی ہیں حالانکہ ان کے دروازوں پر "چوبیس گھنٹے کھلی رہتی ہے" لکھا ہوتا ہے، ایک مختصر سا سرسبز رقبہ اور ان سے پرے دو خشک پہاڑ جن میں سے شہر برم کی چوٹی دکھائی تو درجی ہے لیکن یہ منظر بھی دل میں باگمال اترتا نہیں۔ اور ہاں پتھر کے زمانے کے لوگوں کی طرح خوفزدہ اور دروازوں کے پیچھے پوشیدہ ہوتے ہوئے اعلیٰ ہوٹے جن کے لباس کسی میوزیم میں رکھنے کے لائق ہیں۔

تو پھر جو لوگ ہوٹے کو دیکھتے ہیں اور اسے ہوش رہا کہتے ہیں اور بار بار یہاں واپس آتے ہیں وہ یہاں کیا دیکھتے ہیں؟ شاید یہ موجودہ وقت سے پہلے کا گاؤں ہے، یہاں جو ہوا ہے اسے بیسویں صدی کی ہوا نہیں لگی، ہوٹے انسانی تہذیب کی آخری حد سے ذرا آگے ہے۔ اور اسی لئے یہاں آکر کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہوتی ہے کہ

یہ ہماری بستیوں سے الگ ہے۔۔۔ اور یوں بھی ہوٹے تو صرف آغاز ہے ان حیرت ناک مناظر کا جو ان بھورے پہاڑوں سے پرے شہر برم کی وادیوں میں ہیں۔

یعنی ایک پتھر ملی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی، دیوار پر جتنے بھی کپڑے سوکھ رہے تھے سب سرخ رنگ کے تھے۔ دروازے میں سے ایک ہوشیار لڑکی جھانکتی تھی اور شرما شرما کر بھئی کی طرف دیکھتی تھی اور بھئی اسے اپنے پاس بلائی تھی وہ آتی نہیں تھی۔

میر اور سلجوق "چوک" میں بیٹھے ایک غلیظ سے بابا جی سے باتیں کر رہے تھے۔ بابا جی اونٹی دھاگے کا ایک گولا اپنے سر کے گرد اس طرح تھے جیسے گویا گھماتے ہیں اور یوں وہ دھاگہ بٹ رہے تھے۔

میوند "کے ٹوشاپ ہوٹے" کے بورڈ کے نیچے کھڑی اس پر نکلی عبارت پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی "خوش آمدید۔ کوہ پٹائی کی مہم کے لیے۔ ٹریکنگ پارٹی۔ کے ٹوشاپ ہوٹے۔ کوہ پٹائی کا سامان۔ سیپک بیک۔ خیمے وغیرہ یہاں کرائے پر دستیاب ہیں۔ انگلش اور پاکستانی کھانے بھی ملتے ہیں۔"

مست علی شہر برم ان کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے سگریٹ پیتا تھا اور مسکراتا تھا۔

ہماری آمد سے ہوٹے میں جو ارتعاش پیدا ہوا تھا وہ ختم ہو کر نارمل ہو گیا تھا۔ ہم اب اجنبی نہ تھے۔ ہمیں جی بھر کے دیکھنے کے بعد ہوٹے کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں پھر سے مصروف ہو چکے تھے۔

اوپر پہاڑوں میں سے ایک جوڑا نیچے آیا۔ وہ بلیٹیم کے رہنے والے تھے۔ لڑکی نے سر پر پگڑی سی باندھ رکھی تھی اور شلوار فیض میں خوب لپٹی لپٹائی تھی۔ لڑکا بھی صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ وہ دونوں جب لاہور میں مجھ سے ملنے کے لیے آئے تو اتنے اچھے نہ لگے۔ وہ صرف وہیں اچھے لگتے تھے شہر برم کے پس منظر کے ساتھ ہوٹے میں۔

ہر انسان کی شخصیت میں اس کی اپنی لینڈ سکیپ، پس منظر اور آپ وہوا بھی شامل ہوتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ شمال کے کسی دور افتادہ قصبے یا وادی کے کہیں کو میں نے اپنا کارڈ دیا اور ان میں سے کوئی ایک کبھی لاہور میں میرے گھر تک پہنچ جاتا ہے اور مجھے بیش حیرت ہوتی ہے کہ وہاں میرے ڈرائنگ روم میں وہ کتنا معمولی سا انسان ہو جاتا ہے بلکہ انسان بھی نہیں کوئی چڑ کوئی شے ہو جاتا ہے جو میرے

صوفے پر پڑی ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنی لینڈ سکیپ سے نکل کر باہر آ جاتا ہے، اپنے پس منظر کے بغیر ہوتا ہے۔ وہاں فیئر میڈو میں رائے کوٹ گلیشیر کے اوپر ایک کپے خطرناک راستے پر پھونک پھونک کر قدم رکھنے والا کوئی اور ہوتا ہے۔ وادی روپل میں خشک شام میں پھولوں کے ایک کھیت کے کنارے چپائیاں بنانے والا شخص کوئی اور ہوتا ہے۔ ٹانگا پرست کے نیچے ٹپ میدان کی وسعت میں مجھے چائے کا ایک پیالا تھماتا ہوا پورٹر بس وہیں اچھا لگتا ہے۔ اپنے پس منظر میں اپنی ہوا اور اپنی لینڈ سکیپ میں۔

ہمیں علم نہ تھا کہ ہوشے میں شب بھری کے لیے اب ایک عدد ہوٹل قحیر ہو چکا ہے اور اگر ہم رات گھرنے کا ارادہ کر لیں تو کم از کم اس کے ڈائننگ روم میں کچھ سیٹنگ بیک ڈالے جاسکتے ہیں۔ ہمیں علم ہوتا تو ہم ہوشے میں ضرور ایک رات بسر کرتے۔

کیرس میں میر صاحب کے حکم سے تیار کروا کھانا ہمارا منتظر تھا۔

سکرود میں بھی اطلاع ہو چکی تھی کہ ہم آج شام تک پہنچ جائیں گے۔

اور اگر ہم نہیں پہنچتے تو جیسا کہ یہاں کا دستور ہے آپ کی جیب کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ ہمیں ہوشے سے جانا ہی تھا۔

مست علی ہمیں بتا رہا تھا کہ ماچلو کے آگے سڑک ایک دریا میں سے گزرتی ہے۔ اور شدید ہے کہ اس میں ان دنوں پانی زیادہ ہو جاتا ہے اور اگر ایسا ہوا تو ہمیں پہلو واپس جا کر پھر سکرود جانا پڑے گا۔

ش برم کی برف پہلے ہماری وڈ سکرین میں دکھائی دیتی تھی اور اب وہ پانیوں کے مٹی شیشے میں سے نظر آتی تھی کیونکہ ہم ہوشے سے نکل رہے تھے۔

اوپرٹی گھاس اور بڑے پتھروں والا راستہ اب سائے میں آچکا تھا اور وہاں خشکی تھی۔ وڈ سکرین پر بلند گھاس کے سرسبز پال پریشان ہو کر بچنے چلے جاتے تھے۔

بلندیوں کی سرد مک تیز ہو رہی تھی۔

ایک طویل سڑک کے بعد ہم ایک کپے راستے سے نیچے اتر رہے تھے، نیچے دریائے شیوک پر ایک پل تھا جس کے دوسری جانب سکرود جانے والی سڑک تھی۔ ہم پل کے پار ہوئے اور سکرود روڈ پر آئے وہاں جدھر سے ہم آئے تھے اودھر ایک سنگ میل پر لکھا تھا۔ ہوشے ۳ کلومیٹر۔

”وادی شکر“

وہاں خشک بھوری چٹانوں پر دھوپ تانے کی طرح ٹھنڈی ہو کر ڈھلتی تھی اور بڑے بڑے پتھروں اور خشک گھاس اور جھاڑیوں پر پہلے تھی اب نہیں تھی لیکن اس کی ہلکی سی روشنی ابھی ان پر باقی تھی۔ دھوپ ڈھلتی تھی لیکن بلند ہوتی تھی۔ ہماری جیب وادی شکر کے راستے پر تھی۔

ہم دریائے سندھ کو عبور کر کے دوسری جانب ایک لٹ و دق صحرائی لینڈ سکیپ میں کچھ دیر سفر کرتے رہے اور اس پر ہمیں کسی عظیم صحرا کا شائبہ ہوا لیکن ریت کے یہ نیلے جیب کے ٹائٹل تھے بہت دیر تک نہ رہے اور ہم خشک پہاڑوں میں اٹھتی ایک سڑک پر آ گئے۔ میں حسب عادت کھڑکی سے باہر ”منظر“ کو دیکھ رہا تھا اور وہاں بھوری چٹانوں پر دھوپ ڈھلتی تھی اور اس کی زردی میں سیاہی گھلتی تھی۔ اور ان چٹانوں کو میں دیکھتا رہا اور پھر میں نے انہیں سانس روک کر غور سے دیکھا کہ ان چٹانوں میں وہاں جہاں سے دھوپ جگہ چھوڑ رہی تھی وہاں چٹانوں کی پونٹوں کے آس پاس دھوپ میں بھی اور سائے میں بھی کوئی شے حرکت میں تھی۔ ایسی حرکت جو شارپ فوکس کی اس ڈھلتی دھوپ کی بھوری تصویر کو آؤٹ آف فوکس کر رہی تھی۔ اور اس شے کا رنگ ذرا الگ ہوا اور وہ بھی بھورے رنگ کی چٹانوں ایسی۔ اور ایک نہ تھی۔ اور وہاں یکدم زندگی تھی۔

”عباسی جیب روک دو۔۔۔“ میں نے ذرا آگے ہو کر سرگوشی کی۔

جیب رک گئی۔ ہم سب باہر آ گئے

”وہاں چٹانوں کے قریب۔۔۔“ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

کہاں؟ کہاں۔۔۔ سب کی نظریں بھوری لینڈ سکیپ پر سفر کرتی تھیں۔

"وہاں ابو۔۔۔" یعنی نے ذرا بلند آواز سے کہا اور گردن نیچی کر کے سلوک کو کہنے لگی "بھائی جان چھ ہیں۔۔۔"

سیر نے ان کو دیکھ لیا تھا لیکن وہ بالکل خاموش تھا اس کی حیرت اس کے لبوں پر تھی۔ وہ چھ شاندار بھورے اڑیاں تھے اور ڈھلتی دھوپ میں یوں ساکت کھڑے تھے جیسے وہ کسی قدیم دیوالائی یادگار کے لیے تراشے گئے ہوں۔ انہی چھروں سے جو ان کے آس پاس تھے۔

ہمیں معلوم تھا کہ ہماری ذرا سی حرکت سے وہ چوکے ہو جائیں گے۔

اس وسیع لینڈ سکیپ میں صرف ڈھلتی دھوپ تھی، ایک پہاڑی راستہ تھا اس پر ایک جیب تھی اور جیب کے مسافر تھے اور ان سے تھوڑی دور بلندی پر چھ اڑیاں تھے اور یہ ساری تصویر فی الحال مکمل طور پر فوکس میں تھی اور اسے بہر طور جلد ہی آؤٹ آف فوکس ہونا تھا اور ہم نے طے کر لیا تھا کہ کم از کم ہم اس تصویر کو آؤٹ آف فوکس نہیں کریں گے اور ہم آنکھیں بست دیر کے بعد جھپکتے تھے۔

جانور اپنے قدرتی ماحول میں کتنا شاندار اور اورینٹل لگتا ہے اس کا احساس پہلی مرتبہ ہوا۔

اور پھر ہم میں سے کسی کے کھانسنے کی آواز ان تک پہنچی۔ انہوں نے فوراً ہماری جانب گردنیں گھمائیں اور پھر کچھ دیر کے لیے اسی حیرت سے ہمیں دیکھا جس حیرت سے ہم انہیں دیکھتے تھے اور پھر انہوں نے چند قلائعیں بھرس اور۔۔۔ چٹائیں اور بھوری گھاس خالی ہو گئی۔

"چلیں؟" عباسی نے کہا۔۔۔ "وہ تو چلے گئے"

"یہ تمہارا خیال ہے۔۔۔ وہ یہیں ہیں ہمارے پاس اور رہیں گے۔۔۔"

جیب ایک مرتبہ پھر راستے پر بلند ہونے لگی۔

وادئ شکر سکرو سے زیادہ دور نہیں ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ دریائے سندھ کے دوسری جانب جو پہاڑ ہیں ان کے سائے میں شکر ہے۔ اور یہ وہی راستہ ہے جو کے ٹو کے میں کیمپ تک جاتا ہے اور اگر موسم خراب نہ ہو تو آپ پندرہ دن کے سفر کے بعد پہاڑوں کے اس اہرام کو دیکھ لیتے ہیں۔ ایک بزرگ محقق نے شمالی علاقہ جات پر جو کتاب لکھی ہے اس میں انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ شکر سے انہوں نے کے ٹو پہاڑ کے نظارے کئے اور اس پر فوش چوٹی کو بہ فوکس دیکھا۔ بزرگ محقق کی عقلمانی نظروں نے اس نظارے کو شکر سے ہی دیکھ لیا جو عوام الناس کو پندرہ

دن کے سفر کے بعد دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔

شکر سے آگے داسو ہے اور اس سے پرے اشکولی کا خوبصورت گاؤں ہے۔۔۔ فی الحال وہاں تک جیب نہیں جاتی۔۔۔

بھورے پہاڑ زیادہ بلند نہ تھے۔ راستہ ہموار ہو گیا۔

پہاڑوں کے دوسری جانب نیچے وادی شکر دکھائی دی۔ عباسی نے جیب روک دی۔

"تارڑ بھائی یہاں آپ دیکھیں بھی اور سنیں بھی۔۔۔"

اور یہاں ہم ڈھلتی شام کے سائے میں تھے اور نیچے بہت نیچے دریائے شکر پھیلا ہوا تھا اور وہاں سے اس کے بہاؤ کا شور سفر کرتا ہوا اور ہم تک پہنچتا تھا تو ہم سرسراہٹ میں بدل جاتا تھا۔ لیکن گلتا یوں تھا جیسے دریا کا پھیلاؤ ٹھہرا ہوا ہے۔ ہر شے رکی ہوئی ہے۔۔۔ اور ہوا میں ایک گہرا سکون ہے۔

وادئ شکر کے کھیت اور درخت سائے میں جا چکے تھے۔

نیچے دریا کے کنارے ایک گھر تھا۔۔۔ اور ہم دیکھ سکتے تھے کہ اس کے آس پاس دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔۔۔ یہ وہی گھر تھا جس کی ہر شخص کو تمنا ہوتی ہے اور وہ نہیں ملتا اور اگر مل جائے تو وہ اس میں رہ نہیں سکتا کیونکہ وہ شکر کے شور کا عادی ہو چکا ہوتا ہے۔

جیب نیچے اترنے لگی۔

وادئ شکر کے کھیت بے حد وسیع تھے۔ ٹریکٹر بھی دکھائی دیتے تھے۔

ایک راستہ سیدھا داسو کی جانب چلا گیا اور ہم ریسٹ ہاؤس کی جانب مڑ گئے۔ اور شکر کا ریسٹ ہاؤس۔۔۔

دو کمرے۔ اترتی ہوئی شام۔ نالے کا شور اور اس نالے میں وہ پتھر جن کے بارے میں ایک لاہوریئے دوست نے کہا تھا کہ جناب شکر کے دریا کے پتھر تو حیرت زدہ کڑ دیتے ہیں اور واقعی ان کے رنگ انوکھے تھے۔

اور اس ریسٹ ہاؤس کے سبزہ زار میں ایک غریب الوطن سیاح سر جھکائے ہمیں دیکھتا تھا اور شکایت بھری نظروں سے دیکھتا تھا کیونکہ ہماری آمد سے پتھر وہ ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں مقیم تھا، سارا دن خوبائیاں کھاتا تھا اور رات کو لائین کی روشنی میں فرائیسی شاعری پڑھتا تھا۔ فرائیسی اس لیے کہ وہ خود فرائیسی تھا۔ اور اب ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے اسے نکال باہر کیا تھا کہ سکرو سے صاحب

آ رہے ہیں اور بنگلہ کدوا کے آ رہے ہیں لیکن تم فکر نہ کرو جب وہ اپنے کمروں میں سو جائیں گے تو میں ڈرائنگ روم کے صوفے پر تمہیں بستر بنا دوں گا۔ لائین پاس رکھ دوں گا اور تم فرانسیسی شاعری پڑھتے رہنا۔

سلجوق نے اپنی فرانسیسی کے چند فقرے اس پر آزمائے اور پھر ناک چڑھا کر کہنے لگا۔ فضول سا فرانسیسی ہے خود اپنی زبان بھی نہیں سمجھتا۔

میر نے اس پر "میو فریڈی فریڈ" والی انگریزی آزمائی اور دونوں فرفر گفتگو کرنے لگے۔ میو نہ اور یعنی شکر ٹالے کے کنارے ایک پتھر پر براجمان تھیں اور میرے بلانے پر بمشکل متوجہ ہوئیں اور ہموں کی طرح خوش دلی سے مسکراتے لگتیں کیونکہ ان تک میری آواز نہیں پہنچتی تھی وہاں جہاں وہ تھیں صرف پانی کا شور تھا۔

عباسی کمروں کا معائنہ کر رہا تھا اور چوکیدار کے ساتھ مذاکرات کر رہا تھا۔

دادی شکر ذرا اداس اور بد سی لگتی تھی۔ جیسے اس میں بھید بست ہوں۔

عباسی چوکیدار کے ہمراہ میرے پاس آیا "تارڑ بھائی یہ کتا ہے کہ اسٹنٹ

کشنر فدا حسین دوسرے آچکے ہیں اور آپ کے لیے پیغام دے کر گئے ہیں کہ۔۔۔"

دو برس پہلے شہر جب میں خان اور نظامی کے ہمراہ پہلی بار بلتستان آیا تھا تو خواجہ

مرواد کے حوالے سے فدا حسین سے خیلو میں ملاقات ہوئی تھی اور وہ ان دنوں خیلو

کے اے سی تھے۔ میں انہیں اپنی آمد کے بارے میں سکرو سے اطلاع دے چکا تھا۔

رات کا کھانا ان کے ہاں تھا اور بلتی مسمان نوازی کی روایات کی پاسداری کے

ساتھ تھا۔ شہر کی خوبانوں کا ذائقہ بے حد شاندار تھا۔

واپسی پر اگرچہ سلجوق کے ہاتھ میں نارنج تھی لیکن وہ اس کی روشنی راستے کی

بجائے درختوں اور پرانے مکانوں پر رکھتا تھا اور ہم ٹھوکریں کھاتے چلتے تھے۔ چوک

کے قریب سکھوں کا ایک ویران گوردوارہ تھا۔

ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں فرانسیسی سیاح لائین کی روشنی میں کچھ کھانے

کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ ایک بڑے سے پیالے میں کوئی نامعلوم مخلوق تھا جس کا چمچ

بھر کر وہ منہ میں ڈالا اور پھر دیر تک اس کے ذائقے پر بڑی سنجیدگی سے غور کرتا۔۔۔

میں دیکھ کر وہ بلاوجہ شرمندہ ہوا اور کہنے لگا "میں کسٹرو کھا رہا ہوں۔"

"اس کا ذائقہ کیسا ہے؟" سلجوق نے پوچھا۔

اس نے پھر ایک چمچ مخلوق منہ میں ڈالا اور پھر منہ بنا کر نہایت گراٹھیز لہجے

میں بولا "سٹریچ کسٹرو۔"

"کیوں؟" میر مسکرا رہا تھا۔

"میں نہیں جانتا لیکن میں نے ایسا کسٹرو ساری عمر نہیں کھایا۔۔۔ سٹریچ کسٹرو!"

معلوم ہوا کہ فرانسیسی کئی روز سے اس ریسٹ ہاؤس میں مقیم ہے اور چوکیدار اسے طرح طرح کے "انگریزی" کھانے بنا کر کھلاتا رہتا ہے۔ آج اس نے اسے خصوصی کسٹرو بنا کر کھلایا تھا جو بقول اس کے تمام انگریز لوگ اور امریکی لوگ بہت شوق سے کھاتے ہیں اور جب بھی نہیں ادھر سے ادھر کی طرف جاتی ہیں تو وہ سب صرف شکر ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار کے ہاتھوں کا بنایا ہوا کسٹرو کھانے کے لیے ادھر رک جاتے ہیں۔

"چوکیدار نے کہا تھا کہ یہ فروٹ کسٹرو ہے لیکن یہ صرف سٹریچ کسٹرو ہے۔"

اس نے سر ہلایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چوکیدار سراسر ایک پرائیویٹ ٹریک کے تحت کسٹرو بناتا ہے یعنی پانی میں آٹا گھول کر اس میں تھوڑی سی چینی ملاتا ہے اور پھر اسے ابلال کر فروٹ کسٹرو کے طور پر پیش کر دیتا ہے۔

ٹالے کے شور کے باوجود رات پر سکون گذری اور گہری نیند میں گذری۔ لیکن اس گہری اور پر سکون نیند میں بھی ذہنی شام میں بحوری چٹانوں میں وہ چھ مجھے نظر آئے۔ لیکن وہ حرکت نہیں کرتے تھے، پتھر ہو چکے تھے۔ وہ میرے ساتھ ہی چلے آئے تھے لیکن پتھر ہو چکے تھے۔

اس ٹھنڈک والی صبح میں شکر کے بازار کے پس منظر میں سفیدے کے درخت بلند ہوتے تھے اور ان کے عقب میں پہاڑ تھے اور ان پر کہیں کہیں برف تھی۔

ہمارے ساتھ محمد حسن قانون گو تھے۔ مقامی تحقیق اور لوک داستانوں کی بہ ذات خود ایک داستان۔۔۔ جو منہ جسم، پارٹس اور بارعب۔۔۔ تھمگوے کے بلتستانی بھائی لگتے تھے۔ فدا حسین خود مقدمے چلانے میں مصروف تھے اس لیے محمد حسن آج کے دن کے لیے ہمارے گامڑ تھے۔

شہر کی سبیشلی یہاں کا زہر موہرہ پتھر ہے جس سے تراشیدہ پیالے، انگوٹھیاں اور چھوٹے چھوٹے کھلونے بازار میں فروخت ہوتے ہیں۔

"یہ زہر موہرہ پتھر کہاں سے ملتا ہے؟" میں نے ایک دوکاندار سے پوچھا۔

"گامڑ سے۔۔۔" اس نے کہا۔

"اوپر کہاں سے؟"

”اوپر وہاں سے۔۔۔“ اس نے اوپر اشارہ کیا۔

”آپ بتائیں حسن صاحب؟“

حسن صاحب کھانے ”بس یہ اوپر سے ہی ملتا ہے۔۔۔ کہتے ہیں کہ دشوار گزار راستے ہیں پر خطر چٹانیں ہیں اور وہاں کہیں یہ ملتا ہے اور جس کسی کو ملتا ہے وہ بتاتا نہیں تو بس یہ اوپر سے ہی ملتا ہے۔“

بازار کے قریب ٹالے کے پار شکر کی مشہور خانقاہ تھی۔۔۔

جتنی طرز تعمیر کی یہ عظیم خانقاہ صرف اس لئے دکھائی دیتی ہے جب آپ اس کے پر شکوہ چٹاروں کے پاس سے گزر کر اس کے قدموں میں پہنچتے ہیں اور تب آپ کو احساس ہوتا ہے کہ یہ شاہکار عمارت کتنی بلند اور کتنی پروقار ہے۔ کتنے جنگل اس کی تعمیر میں کام آئے ہوں گے، کتنے پر ہیبت درختوں کے دیو پیکل تنے اس کے ستون بن کر کھڑے ہیں، اور سینکڑوں برسوں سے کتنے لاکھوں لوگ اس کے پاکیزہ ٹھہراؤ میں اس کے فرش پر بٹھکے ہوں گے۔ کیرس۔ خیلو اور شکر کی ان عظیم خانقاہوں کا بیان ممکن نہیں لیکن یہ عبادت گاہیں صداقت اور اپنی منفرد کوہستانی خوبصورتی میں بادشاہی مسجد لاہور اور مسجد قرطبہ سے کم نہیں۔ تقدس صرف شان و شوکت سے ہی ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس کا پیمانہ وہ احساس ہے جو کسی عبادت گاہ میں داخل ہوتے ہوئے آپ کے روم روم میں پھونتا ہے۔

اس کے صحن میں وہ عالی شان چٹار ہیں جنہیں اس خانقاہ کے ساتھ قومی ورثہ قرار دیا جانا چاہئے لیکن ایسا کون کرے، کوئی سکرو آئے اور پھر شکر آئے تو ایسا کرسے۔۔۔ میں ایک مرتبہ پھر ان چٹاروں کی وجاہت اور بلندی کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ قدرت کا شاہکار ہیں۔ میں دوبارہ صرف ان چٹاروں کو دیکھنے کے لیے شکر جا سکتا ہوں۔

”ان چٹاروں کی عمر کیا ہوگی حسن صاحب؟“

”تقریباً پانچ سو برس۔۔۔“

کسی قدیم عمارت کو دیکھ کر ہم کہتے ہیں کہ اس کے درودیوار نے تاریخ کے کیسے کیسے اودار دیکھے ہوں گے جب کہ سنگ و خشت دیکھ نہیں سکتے، البتہ درخت دیکھتے ہیں کہ وہ زندہ ہوتے ہیں، اور چٹار کے پتے تو خزاں میں حنائی ہتھیالیوں کی طرح سرخ ہوتے ہیں تو شکر کے ان شاندار چٹاروں نے کیا کیا نہ دیکھا ہو گا۔۔۔

”اور جب چٹار کی عمر پانچ سو برس سے تجاوز کر جاتی ہے تو اس میں آگ لگ ہے۔۔۔“ حسن صاحب دازھی میں انگلیوں سے کٹھنی کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”ہم نے یہ تو سنا تھا بلکہ کسی حد تک مشاہدہ بھی کیا ہے کہ خزاں میں چٹار چٹوں کی سرفی اتنی تیز ہوتی ہے کہ آگ کا گلاں ہوتا ہے لیکن کیا چٹاں؟“

”جی بالکل۔۔۔“ حسن کہنے لگے ”میں ابھی مسجد کے راستے میں آپ کو ایک چٹار دکھاؤں گا جس میں آگ لگی ہوئی ہے۔“

اور مسجد کے راستے میں وہ چٹار تھا۔ اس کی شبنیاں سوکھ چکی تھیں اور پتے پژمردہ تھے اور تان کھوکھا ہو رہا تھا۔ حسن صاحب نے اس کے تنے میں جھکانا اور کہنے لگے ”خود دیکھ لیجئے“

تنے کے اندر لکڑی کو گھن لگ چکا تھا اور وہ مردہ تھی۔۔۔ ”آگ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی گھن جو لگتا ہے جس کی وجہ سے چٹار مرجاتا ہے اس کو آگ لگنا ہی کہتے ہیں۔۔۔ اور یہ قدرت کی طرف سے ہوتا ہے کہ پانچ سو برس کی عمر کے بعد چٹار مرجاتا ہے۔۔۔“

دھوپ تیز تھی اور راستوں میں دھول تھی لیکن اس دھوپ اور دھول میں مری کی بے چینی نہ تھی بلکہ ٹھنڈ کا شائبہ تھا۔

ایک چوترے پر سالنوردہ لکڑی کی قدیم آرائش میں گارے اور پتروں کا ایک بڑا چوکور کمرہ، اس میں خوشنما لیکن موسموں کی شدت سے اپنے گل بولوں سے خالی لکڑی کی چوکور کھڑکیاں، ایک کونے میں ایک چمچے کے آثار، ایک چندہ بکس اور اس کے اوپر بورڈ ”چندہ بکس برائے مرمت مسجد۔۔۔ اور یہ سب کچھ تیز دھوپ میں۔

اور یہ سمار ہوتی مسجد بلتستان کی قدیم ترین مسجدوں میں سے ہے اور صرف چند ہزار روپے سے اس کی مرمت ہو سکتی ہے یہ مستحکم ہو سکتی ہے۔

پرانا دروازہ گر گیا تو اس کی جگہ ایک نیا نکور دروازہ تو لگ گیا۔۔۔ لیکن باقی عمارت سے الگ اور بے جوڑ۔

ہم سب جوتے اتار کر اندر چلے گئے۔ کتنی قدیم؟ پانچ سو برس۔۔۔ تو جتنی عمر چٹار کی کیا اتنی ہی مسجد کی ہونی چاہئے۔ اس مسجد کی لکڑی کو چٹاں گھن لگ چکا ہے

اور یہ صرف چند برس تک ہی دکھائی دے گی۔ کھڑکی کی سل پر ایک بڑی ساری گھڑی دھری تھی جس میں سے بھورے کانڈ دکھائی دیتے تھے۔ یہ ہاتھ سے لکھے ہوئے قرآن پاک کے اوراق تھے جو لوگ مسجد میں رکھ جاتے تھے۔ ہم نے حسن صاحب کی اجازت سے ان میں سے چند اوراق بطور تحریک چن لئے۔ مسجد کے سامنے پرانی لکڑی کا ایک ڈھانچہ تھا جس کے شہتیر گرے ہوئے تھے اور ڈھانچے کے درمیان میں زمین دھنسی ہوئی تھی اور اس میں بھی لکڑی کے ٹکڑے اور شہتیر گرے ہوئے تھے۔

”یہ ایک مسلمان بزرگ کی قبر ہے۔“ حسن صاحب نے قریبی درخت کے سائے میں ہو کر چہرے سے ہیندہ پونچھا۔ ”اب ڈھسے چکی ہے، آپ اگر اندر جا کر اس گڑھے میں جھانکیں تو شاید بزرگ بھی نظر آجائیں۔“

یہاں بھی دھوپ تھی اور کسی قدم مقبرے کا ڈھانچہ تھا، صرف شہتیر وہ گئے تھے اور قبر کی جیومیٹرک شکل باقی تھی اور یقیناً بزرگ کے آثار بھی جھانکنے سے شاید دکھائی دے جاتے۔

”یہ بزرگ پہلے ایک بدھ راہب تھے۔ ان کا نام شرنگ زانگ سپا تھا اور وہ پورے لداخ اور تبت میں اپنی پارسائی اور نیکی کی وجہ سے جانے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہمہ وقت ”یاستو“ کی تسبیح کیا کرتے تھے جو بدھ مذہب کا کوئی منتر ہے اور ایک روز کیا ہوا کہ ان کی زبان سے ”یاستو“ کی بجائے ”یا محمد“ جاری ہو گیا۔ اور اسی شب انہیں خواب میں رسول کریمؐ کی زیارت ہوئی اور انہیں بتایا گیا کہ شکر میں ایک مسلمان ولی اللہ تشریف لائیں گے اور تم ان کے ہاتھوں اسلام قبول کر لینا۔ چند روز بعد سید علی ہودانی شکر تشریف لائے اور اس بدھ راہب نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ اس قبولیت کے بعد ان کی پارسائی اور نیکی میں اضافہ ہوا اور وہ ایک مسلمان بزرگ کی حیثیت سے پورے علاقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ یہ ان کی قبر ہے۔“

شکر کے اتنے بڑے بزرگ کی قبر کا کوئی پرسان حال نہیں۔

”اور یہ پتھر۔“ حسن صاحب جس پتھر پر ایک پاؤں رکھ کر کھڑے تھے اسے جھک کر چھوتے ہوئے بولے ”یہ پتھر بھی قبر ہے۔ ایک ایسے راجہ کی جو رعایا کے بچوں کو کھا جایا کرتا تھا۔“

یعنی نے ایک جھرجھری لی اور میرا ہاتھ تھام لیا ”کیا جج ابو؟“

”ہاں بیٹے۔“ حسن صاحب بولے ”یہ علاقے تمام دنیا سے کئے ہوئے تھے یہاں بہت عظم ہوئے۔ اگرچہ یہ ایک لوک کمائی ہے لیکن وہ راجہ ایسے ہی تھے۔ اور پھر دیکھ لو ان ظالم راجاؤں کی قبروں کے نشان بھی باقی نہیں۔“

حسن صاحب نے بتایا کہ پرانے وقتوں میں یہاں راجہ کا مقبرہ تھا۔ اور جب مقبرہ ڈھس گیا تو لوگ اس کے پتھر اٹھا کر لے گئے۔ اور باقی بس یہی ایک پتھر ہے۔

”ذرا اوپر دیکھیں۔“

ہم سب نے نہایت فرمانبرداری سے اوپر دیکھا۔ خشک پہاڑ جو ہم پر جھکے ہوئے تھے اور تیز دھوپ میں تھے۔

”وہاں بلندی پر جو دیواروں کے آثار ہیں یہ شکر کا قلعہ تھا اور اس کے ساتھ راجہ کا محل تھا۔ یہاں جہاں ہم کھڑے ہیں رعایا کا اجتماع ہوتا اور سب لوگ اوپر پہاڑ کی طرف دیکھتے جہاں محل تھا اور وہاں سے راجہ اترتا تھا۔ کیسے اترتا تھا؟ محل سے لے کر یہاں تک بکری کے بالوں کا ایک موٹا رسر بانڈھا گیا تھا۔ راجہ ایک ڈولی میں سوار ہوتا اور اس ڈولی کے اوپر ایک کنڈا لگا ہوتا یعنی ایک کپ۔ اور اس کپ کو رستے کے اوپر لگا دیا جاتا اور راجہ صاحب کی ڈولی بڑی تیز رفتاری سے نیچے یہاں تک آ جاتی۔ راجہ اپنی رعایا کی شکایتیں سنتا اور پھر اسی ڈولی کے ذریعے واپس اپنے محل میں چلا جاتا۔“

اس میں ایک بہت اہم سوال ہے اٹکل حسن۔ ”سہلوق نے عینک درست کر کے اوپر اس چوٹی کو دیکھا جہاں محل کے آثار تھے۔ یہ تو درست ہے کہ راجہ صاحب ڈولی میں سوار ہو کر رستے پر کپ لگا کر بھٹکتے ہوئے نیچے آ جاتے تھے لیکن وہ یہاں سے بلندی کی طرف خود بخود کیسے چلے جاتے تھے؟“

”بیٹے آپ نے شاید کہیں بلتستان یا ہنزہ کے علاقے میں دریاؤں اور ندیوں پر بنے ہوئے ”جھولا برج“ دیکھے ہوں؟ یعنی دریا کے اوپر ایک رسر اور اس کے ساتھ لٹکا ہوا ایک جھولا جس پر وہ شخص بیٹھ سکتے ہیں اور پھر وہ اپنے آپ کو جھلاتے ہوئے پار چلے جاتے ہیں۔ یا پھر ایک جانب کنارے پر بیٹھا ہوا شخص اس جھولے کے ساتھ بندھے ہوئے رستے کو کھینچ کر اسے چلاتا ہے۔ بس یہی سسٹم یہاں بھی رائج تھا۔ جب راجہ صاحب رعایا سے فارغ ہو جاتے تو اوپر محل میں منتھران کے کارندے اس

رے کو کھینچے جو ڈولی کے ساتھ بندھا ہوتا تھا اور یوں ڈولی اور راجہ صاحب اوپر محل میں۔۔۔

”ہوں“ میر نے سر ہلایا۔ ”چر لفت تھی اس زمانے کی۔۔۔“

شکر نالے کے پار ایک نہایت نئی خانقاہ تھی اور اس کی چھت پر جتنی شکل کا ایک ستارہ تھا۔ خانقاہ ویران تھی۔ ایک جھکا ہوا بجتی آیا اور اس نے ہمیں کافر جان کر شور مچا دیا۔ حسن صاحب نے اسے تسلی دی لیکن اس کی تسلی نہ ہوئی کیونکہ وہ بار بار چنگی بجا کر رقم کا مطالبہ کر رہا تھا اور ہم صرف اسے مسکراہٹ دیتے تھے اور وہ کہتا تھا کہ یہ کافر ہیں میں انہیں خانقاہ میں نہیں جانے دوں گا۔۔۔

خانقاہ چٹانوں کے اوپر آسمان کو اٹھتی بلندی کے عین نیچے تھی۔۔۔ اور اسی بلندی پر قدیم محل اور دفاعی حصار کے آثار تھے۔

محمد حسن گویا شکر کے شہر زاد تھے کہ ایک کہانی ختم ہوتی اور وہ دوسری داستان شروع کر دیتے۔

”وہاں وہ شہزادی رہتی تھی جو مرنے کے بعد اب بھی اہل شکر کی خوشیوں میں شریک ہوتی ہے۔“

”مرنے کے بعد بھی؟“ یعنی کا منہ کھل گیا۔

”امپا سیل“ میر نے کندھے جھٹکے۔

محمد حسن کسی شہر قدی داستان کو بوڑھے کی طرح مسکرائے ”لداخ کا بدھ راجہ شکر کی مسلمان شہزادی کے ساتھ شادی خواہش مند تھا چنانچہ وہ بارات لے کر یہاں پہنچ گیا۔ شکر کا راجہ اس کا ماتحت تھا لیکن اس نے پس و پیش کی۔ لداخی راجہ نے دھمکی دی کہ اگر شہزادی کی شادی اس کے ساتھ نہ کی گئی تو وہ شکر کے محل کے اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔

”پتھر سے پتھر بجا دے گا چاچا جی۔“ سلجوق نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”یہاں

اینٹ کہاں۔“

”تو جناب۔۔۔ سلجوق صاحب آپ سچ میں مت بولے ورنہ میں داستان بھول

جاؤں گا۔“

”سوری انگل۔۔۔“

ظاہر ہے مسلمان شہزادی لداخ کے چھٹے اور چچی داڑھی والے راجے سے

شادی کرنے پر رضامند نہیں تھی چنانچہ وہ اپنے ایک بزرگ استاد کے پاس گئی جس نے اسے ایک وظیفہ بتایا۔

”اور لداخی راجہ کی بارات آئی۔۔۔“

”راجہ کی آئے گی بارات۔۔۔؟“

”ہاں یعنی بی بی اور راجہ کی بارات آئی۔ اور وہ شہزادی سطلے پر بیٹھی اور سجدے میں چلی گئی۔ جب بہت دیر تک نہ اٹھی تو سیلیاں اس کے قریب کھینکیں تو وہ۔۔۔“

”مر چکی تھی۔۔۔“ یعنی فوراً بولی۔

”نہیں۔۔۔ غائب ہو چکی تھی اور وہاں صرف اس کا سرخ جوڑا اور زیور

پڑے ہوئے تھے۔۔۔ اور اب یہ شہزادی شکر آتی رہتی ہے۔ جب کہیں شادی ہوتی ہے تو وہ سرخ جوڑے میں دکھائی دیتی ہے ہنستی ہوئی اور جب کہیں کوئی فوجی ہوئی ہے تو وہ روتی ہوئی آتی ہے۔“

”حسن صاحب آپ نے کبھی اس شہزادی کو دیکھا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے تو نہیں لیکن کئی ایسے بزرگ ہیں جنہوں نے اسے دیکھا۔۔۔“

”آخری مرتبہ کب نظر آئی تھی؟“

”تقریباً دس بارہ برس پہلے۔۔۔“

”خدا کرے آج تو نہ آئے۔۔۔ اور کل ہم چلے جائیں گے۔“ یعنی ذرا ڈری ہوئی تھی۔

”اور اب ہم شکر کا کونا قابل دید مقام دیکھیں گے؟“ میر نے پوچھا۔

”اب ہم وہ پتھر دیکھیں گے جو پریاں اٹھا کر لائی تھیں۔“

”سچ کی پریاں؟“ یعنی پھر بول اٹھی۔

”یہ ایک بیوقوف بچی ہے۔“ سلجوق نے منہ دو سری جانب کر کے انگلی یعنی کی کہنی کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”نہیں جی یہ ایک بیوقوف بچی ہرگز نہیں ہے۔ اور ہر مستان میں پریاں ہوتی ہیں کیوں انگل۔۔۔“

”بالکل ہوتی ہیں۔“ حسن صاحب داڑھی پر ہاتھ پھر کر بولے۔

ہم ایک خاموش سے محلے میں گئے اور قدیم طرز کے چند چھوٹے چھوٹے مکان

دیکھے۔ کھڑکیاں کشمیری طرز کی تھیں اور ان کے فریم دیواروں سے الگ ہونے کو تھے۔ یہیں پر وہ تین چار پتھر تھے جنہیں پریاں اٹھا کر لائی تھیں۔

”بڑے زور آور لوگ باہر سے بھی آئے اور ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکے۔“ حسن صاحب سلجوق کو دیکھتے ہوئے مسکرائے ”اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ انہیں پریاں لائی تھیں۔“

عباسی نے ایک پتھر کو جھک کر چھوا ”تھوڑی دیر جھکا رہا اور پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔“

”ابو وہ پھر آگیا۔“ یعنی ہنسی ہوئی میرا بازو تھام کر بلکہ جھنجھوڑ کر کہنے لگی ”ایک اور آگیا۔“

”ہاں ابو وہی ہے۔“ سیر کی باچیں کھل گئیں اور سلجوق بھی سر ہلاتا مسکراتا اور دیکھنے لگا جدھر وہ تھا۔

اور وہ جب بھی دکھائی دیتا انتشار کا باعث بنتا۔ جو کچھ ہو رہا ہوتا وہ چھوٹ ہو جاتا۔ مفصل کا سلسلہ ٹوٹ کر کہیں اور چلا جاتا اور ہم سب صرف اور صرف اس کی جانب متوجہ ہو جاتے۔ وہ سکروں میں کم ملتا ہے۔ جوں جوں آپ سکروں سے دور ہوتے ہیں اور تہذیب کے جعلی دائرے سے پرے ہوتے ہیں وہ نظر آنے لگتا ہے لیکن زیادہ تعداد میں نہیں بس کبھی کبھی۔ وہ غیلہ میں بھی ملتا ہے، ہوشے میں کافی دکھائی دیتا ہے اور یہاں شکر میں اسے ہم نے پہلی بار دیکھا۔

پستہ قد۔ گرم پرانے کپڑوں میں لپٹا ہوا۔ سر پر اونچی بندر ٹوپی۔ ہاتھ اور پاؤں چھوٹے بچوں ایسے خوب کھیلے سے۔ وہ زیادہ تیز نہیں چلتا کیونکہ اس کی ٹانگیں چھوٹی ہیں۔ چہرہ گولائی کی جانب اور اس میں نہایت صمیم آنکھیں۔ اور ٹھوڑی پر چند بال لٹکتے ہوئے۔ لیکن اس کی سب سے بڑی دو علامتیں ہیں، ایک تو اس کا سدا اپنے آپ سے بہت ہی خوش مسکراتا ہوا چہرہ اور دوسری یہ کہ اسے دیکھتے ہی آپ اسے گدگدی کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ اتنا پیارا اور بھولا سا نیلی بیڑ لگتا ہے۔ اس سے پشیمونہ میں بچوں کو منع کرنا وہ اس تک پہنچ چکے تھے اور اس کے ساتھ حرکتیں کرنے میں مشغول تھے۔ اور وہ تو شاید انہی کے انتظار میں تھا۔ میں نے حسن صاحب سے اس بابے کے بارے میں پوچھا۔ ان کی معلومات کے مطابق یہ منگول بابے ہیں، ٹھنڈے اور بھولے بھالے اور تھوڑے سے غیوط الحواس بھی ہیں۔ مجھے حیرت صرف اس بات

پر ہے کہ میں نے اس نسل کا کوئی جوان کہیں نہیں دیکھا۔ لگتا ہے جیسے یہ بابے کہیں پیدا انہیں ہوتے بلکہ یکدم نمودار ہو جاتے ہیں۔ ہر حال اس منگول بابے کی آمد سے ہماری تحکون دور ہو گئی۔ میں نے بچوں کو واپس بلایا تو سیر کہنے لگا ”ابو صرف ایک مرتبہ اور گدگدی کر لوں باباجی کو۔“

وہ بھانٹا ہوا گیا اور باباجی کو گدگدی کی۔ باباجی اور زیادہ مسکرائے گئے۔ یعنی کا خیال تھا کہ ہمیں کم از کم ایک منگول بابا کو سلا پھسلا کر لاہور لے جانا چاہئے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ ایسے بابا لوگ شرکی ناخوش اور لالچ بھری ہوا میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

بچے بڑی مشکل سے باباجی سے الگ ہوئے۔ اور وہ الگ ہوئے تو میر عباسی بابا جی کو گدگدیاں کرنے لگا اور میں نے اسے ڈانٹا تو وہ بھی ”سر“ کہہ کر پرے ہو گیا۔ شکر کے سب سے پرانے محلے میں جولاہوں کے چند گھر ہیں۔ اور یہ جولاہے بھی پستہ قد ہیں اس لیے اپنے مکانوں کی چھتیں چھ فٹ کی بلندی پر ہی ڈال لیتے ہیں۔ تاریک گھروں کے اندر رہائشی کو ٹھنڈیاں تھیں جن میں شاید بچے تھے شاید مال مویشی تھے اور پھر گرم کپڑے اور دریاں بنانے کی کھڑیاں تھیں۔

ایک کھڑی پر ایک چھوٹا سا خوفزدہ جولاہا جھکا ہوا تھا۔ اور کوٹھڑی میں روشنی کے لیے صرف ایک سوراخ تھا۔ وہ ہمیں اپنا بہترین کپڑا دکھانے کے لیے آگیا۔ ایک کچی دیوار کے پیچھے اس کے بوڑھی جولاہی ہمیں دیکھتی تھی اور وہ اپنے خاوند سے بھی بالشت بھر چھوٹی تھی۔

”فوفو فوفو۔“ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا اس کے سرخ اور پھولے ہوئے مسوڑھوں میں صرف دو چار دانت باقی تھے۔ وہ اپنے چہرے کو ان ہاتھوں سے چھپاتی تھی جن سے وہ ابھی ابھی آنا گوندہ رہی تھی۔ خوفزدہ جولاہے نے کپڑے بازو پر لٹکایا اور تصویر کے لیے تیار ہو گیا۔ جولاہی نے دانت نکال دیئے۔

ریسٹ ہاؤس واپسی پر ہم ایک کوٹھڑی نما مسجد کے قریب سے گزرے۔ کبھی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے دو تین منگول بابے۔ چند بوڑھی عورتیں اور ایک دو نوجوان۔ خستہ حال اور مٹی سے اٹے ہوئے۔ ایک دور دراز وادی میں بد حالی اور عسرت میں

”دیوسائی اے دیوسائی“

وہ میدانِ دوسروں کو راستہ دے دیتا ہے لیکن میں جب بھی ادھر کا قصد کرتا ہوں تو کبھی۔۔۔۔۔ ابھی دیوسائی پر برف نہیں پگھلی۔۔۔۔۔ صد پارہ سے دیوسائی ٹاپ تک جانے والی سڑک نالے میں گر چکی ہے۔۔۔۔۔ کھلا پانی پر ابھی پل تعمیر نہیں ہو سکا اور اسے عبور نہیں کیا جاسکتا۔۔۔۔۔ آپ کا خیمہ بہت باریک ہے صاحب! ادھر برف گرے گا تو تم مر جائے گا۔۔۔

چند روز قبل ہزار فٹ کی بلندی پر دیوسائی میدان میں ایسے پھول ہیں جو کم لوگوں نے دیکھے ہوں گے اور دیکھ جائیں گے جو پھلیوں کا شکار کرتے ہیں اور وہاں تیز اور سرد ہوائیں چلتی ہیں۔ اور کیسے پتہ چلتا ہے کہ دیوسائی کی برقی پکٹل چکی ہیں۔ اور اسے عبور کیا جاسکتا ہے۔ صدیوں سے شاید ہزاروں برسوں سے کھجور یا چرواہے اس میدان میں نشوونما پانے والی لمبی گھاس اور ہریاں کے لئے اپنے جانوروں کے ہمراہ ادھر آتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ آگے برف ہے تو وہ برف کی حد پر قیام کرتے ہیں اور پھر جوں جوں برف پگھلتی ہے اور پیچھے ہٹتی ہے وہ اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور پھر ایک روز صد پارہ گاؤں کے قریب اتر کر سکروں کے بازار میں پہنچ جاتے ہیں اور ان کو دیکھ کر لوگ جان جاتے ہیں کہ دیوسائی میدان میں برف پگھل چکی ہے۔ راستے کھل گئے ہیں۔

اگر آپ دیوسائی کو عبور کرنا چاہتے ہیں تو آپ سکرو سے صدارہ گاؤں جاتے ہیں اور پھر وہاں سے دیوسائی اور دوسری جانب چلم چوکی کے راستے استور پہنچ جاتے ہیں۔ اسی راستے پر آپ استور سے سکرو کی جانب آ سکتے ہیں۔

میں نے دونوں جانب سے اسے دیکھا تھا۔۔۔ اسے نہیں بلکہ ان راستوں کو

رست ہاؤس کے برآمدے میں فرانسیسی سیاح اپنے آگے رکھی تپائی پر جھکتا تھا،
کچھ کھانا تھا اور پھر بہت دیر تک چھت کو دیکھتے ہوئے اسے ٹھٹھا تھا۔
”ہیلو۔۔۔۔۔“ سلجوق اس کے پاس گیا، ”کیا کھا رہے ہو؟“
”وہ پلاؤ۔۔۔۔۔“ وہ چونکا ”چونکہ ار نے مجھے پلاؤ پکا کر دیا ہے“
”کیسا ہے؟“

اس نے پلیٹ میں ڈھیر مٹوے میں سے بمشکل ایک چمچہ بھرا اور منہ میں رکھ کر حسب معمول سوچ میں مبتلا ہوا اور پھر کہنے لگا "سٹریچ پلاؤ۔"

وہاں خشک بھوری چٹانوں پر دھوپ تانبے کی طرح لٹھڑی ہو کر ڈھلتی تھی اور بڑے بڑے پتھروں اور خشک گھاس اور جھاڑیوں پر پہلے تھی اب نہیں تھی لیکن اس کی ہلکی روشنی ابھی ان پر باقی تھی۔۔۔ دھوپ ڈھلتی تھی لیکن بلند ہوتی تھی۔ ہماری جیب داوی شکر کے آخری منظر سے نیچے آچکی تھی۔

خنگ بھوری چٹانوں کو ہم سب نے بہت دیر تک خاموشی سے ایک تسلسل کے ساتھ غور سے دیکھا لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔۔۔ آج وہ وہاں نہیں تھے اور ہمارے دل میں خیال آیا کہ کیا وہ پہلے وہاں تھے؟۔۔۔ اس چینی فلسفی کی طرح جو ساری عمر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس نے یہ خواب میں دیکھا تھا کہ وہ حقیقی بن چکا ہے یا وہ حقیقی تھا اور اب خواب دیکھ رہا ہے۔۔۔ ہم یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ وہ چھ شاندار بھورے اڑیاں جو کسی دیوالائی یادگار کی طرح دھوپ میں تراشے ہوئے لگتے تھے۔۔۔ کیا ہم نے دیکھے تھے؟۔۔۔ یا پھر وہ ہم تھے وہاں چٹانوں میں اور وحشی شام میں اور ہم نے ایک پہاڑی راستے پر ایک جیب کے قریب کھڑے چھ مسافروں کو دیکھا تھا۔۔۔

اس کا انجام کیا ہو گا۔ فی الحال منصوبہ یہی تھا کہ ہماری ٹیم چار ممبروں پر مشتمل ہوگی۔ عباسی، سلجوق، سمیر اور میں۔۔۔ اور کم از کم دو پورٹر۔۔۔ اور اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ دیوسائی ٹاپ تک پہنچا کیسے جائے۔۔۔ ہم قلب علی صاحب کے دفتر چلے گئے۔ وہ بلتستان کی سڑکوں کے انچارج تھے۔ انہیں تو معلوم ہو گا کہ سکروڈ سے اوپر دیوسائی جانے والی سڑک چھپوں کے لئے کھل گئی ہے یا ابھی زیر مرمت ہے۔

"اوہ تو یہ ہے تارڑ صاحب۔۔۔" قلب علی حسب معمول بے حد مسرور اور دنیا سے خوش تھے "کہ۔۔۔ جب اوہر عرف اور کلینئر ختم ہو جاتا ہے تو ہم روڈ کلینئر کرنے کے لئے آدمی روانہ کر دیتا ہے۔۔۔ ابھی وہ گئے ہیں لیکن تین چار دن سے پتہ نہیں کہ کہاں سے روڈ کلینئر کر دیا لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ صدپارہ گاؤں سے آگے نالے پر جو پل ہے روڈ وہاں تک بالکل کلینئر ہے۔۔۔"

"اور اس سے آگے؟"

"اس سے آگے تو پیدل جانا ہو گا۔ جیسے کلٹری والے آتے جاتے ہیں۔۔۔"

"کیسے جائیں گے جناب۔۔۔" عباسی مسکرانے لگا "اوہر چڑھائی ہے بہت زیادہ۔۔۔ چار پانچ ہزار فٹ کی چڑھائی ہے۔۔۔"

"ویسے صدپارہ گاؤں کے پل تک آپ میری جیب لے جائیں۔ اسے وہاں چھوڑ کر اوپر جائیں۔ اوہر رات کریں اور اگلے دن نیچے اوہر تک آجائیں جدھر آپ جیب چھوڑ کر گئے تھے تو اوہر ڈرائیور موجود ہو گا۔ میں آپ کو پانچویں اس لئے نہیں دے رہا کہ راستہ تنگ ہے اور پانچویں چٹانوں سے لگے گی۔۔۔"

"قلب علی صاحب میں اپنے قلب کی گمرائیوں سے آپ کا مشکور ہوں۔۔۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اور عباسی۔۔۔"

"سر۔۔۔"

"دیوسائی ڈیش کے لئے ہنگامی بنیادوں پر تیاری شروع کر دی جائے۔۔۔"

جھیل صدپارہ سے نکلنے والے نالے کے پانی دیوسائی کی برفوں کے تھے اور ان میں تندی اور شدت تھی اور وہ ملک ٹیک میں اچھلتے جھاگ اڑاتے دودھ کی طرح سفیدی میں اٹھتے ہوئے نیچے آ رہے تھے اور ہم اس کے کنارے پر ریگتی راکھی جیب

میں اوپر جا رہے تھے "اوپر جدھر سے وہ آ رہے تھے۔ صدپارہ کی وادی پر شام کا گمان ہوتا تھا لیکن یہ سور تھی جو بلند پہاڑوں کے عقب میں تھی اور اس کی روشنی ابھی اندر نہیں آئی تھی۔ ہمارے بدن بیٹکوں میں لپٹے سرد ہوا سے محفوظ تھے اور چہرے اس سرد ہوا کی کات سے زندگی کے قریب ہوتے تھے، سردی سے آنکھوں میں نمی تیرتی تھی۔

ایک سفید راکھی جیب، ڈرائیور سمیت سات افراد۔۔۔ عباسی، سلجوق، سمیر، پورٹر علی۔۔۔ اور پورٹر حسین۔۔۔ اور ان سات افراد کے آس پاس اور اوپر نیچے دیوسائی ڈیش کا سامان۔۔۔ نیچے، رک سیک، تھیلے۔۔۔ کھیل وغیرہ وغیرہ۔۔۔ اور ہم سب اس سامان میں گل عمر تھے اور مل نہیں سکتے تھے۔ ایک دوسرے کو سن سکتے تھے، دیکھ نہیں سکتے تھے۔

جیب صدپارہ جھیل کے قریب ہو گئی۔ اس کے ساکن پانیوں میں دائرے پھیلتے تھے۔ ان پھیلیوں کے جو ہماری قسمت میں نہ تھیں۔۔۔ اور پھر جھیل کا وہ کنارہ آگیا جس میں چھوٹے چھوٹے نالے ایک وسیع ریت کے علاقے میں سے گذرتے پانی میں گر رہے تھے، جہاں چند روز پہلے ہم نے پھیلیاں پکڑنے کی کوشش کی تھی۔

"سر جی ناشتہ نہ کر لیں۔۔۔" یہ کہیں دیکھے ہوئے عباسی کی آواز تھی "تمیں پرائیوٹ کچا کر لایا ہوں۔۔۔"

"تمیں؟ انہیں کھائے گا کون؟"

"کام آئیں گے سر۔۔۔ خود نہ کھا سکے تو کسی دیکھے کو کھلا دیں گے سر۔۔۔ تو رک جائیں ناشتہ کے لئے؟"

"نہیں ابھی نہیں۔۔۔"

اور میں رکنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے اب بھی خدشہ تھا۔۔۔ کوئی ہمارا پیچھا کرتا ہوا سکروڈ سے آئے گا اور گے گا فہمو تم دیوسائی نہیں جاسکتے۔۔۔

آج صبح منہ اندھیرے یوسف حسین آبادی آ گئے "تارڑ صاحب میں نے سنا ہے کہ آپ بچوں کے ساتھ دیوسائی جا رہے ہیں۔۔۔"

"ہی۔۔۔ یعنی تو نہیں جا رہی سلجوق اور سمیر جائیں گے اور ماشاء اللہ جوان ہیں۔۔۔"

"دیوسائی اچھی جگہ نہیں ہے تارڑ صاحب۔۔۔" یوسف گہری تشویش کے ساتھ کہنے لگے "خطرناک ہے۔۔۔ بری جگہ ہے۔۔۔ اور وہاں سردی بھی بہت ہے۔"

بلندی کی وجہ سے بھی انسان بیمار پڑ جاتا ہے۔۔۔ آپ نہ جانیے۔۔۔

اس بیان کے بعد میں اندر سے اتنا مضبوط نہ رہا جتنا کہ پہلے تھا۔۔۔ اگر سکرو کا ایک باسی یہ کہتا ہے کہ دیوسائی بری جگہ ہے تو۔۔۔ "تیاری مکمل ہے۔۔۔ جپ میں سلمان بیک ہو چکا ہے" میر اور سلجوق نے کل کے نو موٹوں کے باہر نیچے ہسٹلہ کر کے انہیں چیک کر لیا تھا اور۔۔۔ بہر حال یہ ضروری تو نہیں کہ ہم ٹاپ تک جائیں، بس جہاں تک آرام سے اور حفاظت سے جاسکے جائیں گے۔۔۔

یکدم میرے بدن میں چٹنے والی چیزیں رک گئیں اور خاموشی ہو گئی۔ جپ رک چکی تھی۔ سب لوگ اتر گئے۔۔۔ ہمارے عین نیچے صدپارہ گاؤں صبح کی پہلی دھوپ میں تھا۔۔۔

پورٹر علی نے اپنا سلمان اٹھالیا "میں یہ سلمان چھوڑ کر آتا ہوں صاحب۔۔۔ بال بچے کو بتاتا ہوں کہ میں ایک رات کے لئے دیوسائی جا رہا ہوں۔ ابھی آتا ہوں۔"

وہ ڈھلوان راستے پر نیچے گاؤں کی جانب اترنے لگا۔

علی کسی غیر ملکی مہم کے ہمراہ ہاتورو ٹھیکسز کے علاقوں میں تھا اور اب اس مہم کے ارکان کی ڈاک وصول کرنے کے لئے سکرو آیا تھا۔ سکرو آیا تو ہم نے اسے قابو کر لیا کیونکہ وہ صدپارہ کا باسی تھا اور دیوسائی کو جانتا تھا۔۔۔

صدپارہ جھیل کے پانیوں کو ہم بہت دور چھوڑ آئے تھے۔ وہ یہاں سے ایک چھوٹے تالاب کی طرح دکھائی دیتی تھی جس میں اس کا سبز جزیرہ ایک ساکن کشتی تھا۔ پس منظر میں ہر فوش چوٹیاں مکمل دھوپ میں روشن ہو رہی تھیں۔

ڈرائیور نے جپ کا ہارن زور زور سے بجایا۔۔۔ اور نیچے صدپارہ گاؤں کی ایک جھٹ پر ایک بوڑھی عورت نے سر اٹھا کر ہماری جانب دیکھا لیکن اسے اتنی دور سے ہم کہاں نظر آتے ہوں گے۔

"سر جی یہاں بڑی آسانی سے ناشتہ کر سکتے تھے۔۔۔" عباسی نے شکایت آمیز لہجے میں کہا "پراٹھے لٹٹے ہو گئے ہوں گے"

ڈرائیور نے ایک مرتبہ ہارن بجایا۔

یہاں میں نے محسوس کیا کہ ہوا میں آکسیجن کم ہے۔۔۔ اور ادھر ادھر گھومنے سے سانس چڑھنے لگتا ہے۔

علی اپنا کبیل اور کچھ سلمان اٹھائے اوپر آ رہا تھا۔

"واہ۔۔۔" عباسی نے اس کا چھوٹا سا رک سیک چیک کیا "باہر کا ہے؟"

"جی صاحب ایکسی ڈیٹشن کا ہے۔"

ایک مرتبہ پھر ہم جپ میں پیک ہوئے اور سفر شروع ہو گیا۔

ایک ٹالہ اوپر سے اتر رہا تھا اور ہم اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی سڑک پر چل رہے تھے۔ دونوں جانب بلندی عمودی تھی اور اس لئے دھوپ ابھی یہاں نہیں آئی تھی۔

ٹالے کے پانی ٹیلے تھے اور نیلو ٹیل تھے اور دیوسائی سے آرہے تھے۔۔۔

ہم راستے کی خطرناکی کے لئے ذہنی طور پر بالکل چوکے تھے۔ ہم نے اس کے پر خطر ہونے کی ساری داستانیں سن رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک اس کیمرو مین کے بارے میں تھی جو کسی ڈاکو منزی قلم کے پونٹ کے ہمراہ جپ پر دیوسائی جا رہا تھا۔ جپ جھول رہی تھی اور ڈھلوانوں پر سے ٹھکسی ہوئے نیچے آتی تھی اور مزدور فوری طور پر اسے تمام لیتے تھے۔ کیمرو مین نے بہت ضبط کیا اور آخر کار چھلانگ مار کر اتر گیا اور کہنے لگا "میں۔۔۔ میں ملازمت سے استعفیٰ دیتا ہوں۔ اب اور اسی وقت" ڈائرکٹر نے بہت سمجھایا لیکن وہ مردانا ڈٹا رہا کہ مجھے حق حاصل ہے کہ میں جب جی چاہے استعفیٰ دے دوں اور وہ میں نے دے دیا۔ اس پر ڈائرکٹر صاحب نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے ذاتی ذخیرے میں سے ایک بوقلم ام النباشٹ کی نکالی اور کیمرو مین کو حکم دیا کہ بس غٹ غٹ کر کے اسے اپنے اندر اٹھیل لو۔۔۔ کیمرو مین نے ڈائرکٹر کی ڈائرکشن پر عمل کیا جس کے نتیجے میں وہ خاصا خراب ہو گیا اور ایک بے پرواہ کیفیت میں جھونے لگا۔ اس سے پوچھا گیا کہ اب تو دیوسائی روڈ پر سفر کرتے ہوئے ڈر نہیں لگے گا؟ اس نے کہا بالکل نہیں۔۔۔ میں جپ میں سوار ہو جاتا ہوں لیکن اس سے پیشتر میری آنکھوں پر ایک پٹی کس کر باندھ دی جائے تاکہ۔۔۔

لیکن ہم ابھی کسی ایسے حصے سے نہیں گذرے تھے جہاں آنکھوں پر پٹی باندھ کر سفر کرنے کی نوبت آئے۔

اور پھر وہ پل آ گیا۔۔۔ پرانی روڈ سیدھی جا رہی تھی اور نئی روڈ پل کے پار تھی۔

ہم ادھر سائے میں تھے اور معلق پل کے دوسری جانب چٹائیں دھوپ میں تھیں۔۔۔ اوپر سے ایک قافلہ اتر رہا تھا۔ دس بارہ "زود" جن پر سلمان لدا ہوا تھا اور ان کے ہمراہ انہیں ہانکتے ہوئے کلتری کے باشندے۔۔۔ زود جپ کے قریب آتے تو اس کی شکل دیکھ کر بدک جاتے۔۔۔

پل چونکہ ہماری ٹریک کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے ہم ٹریک کو ہٹا کرنے کے لئے جیب سے اتر گئے۔

پل کے پار اوپر اٹھتے پتھر لے راستے پر چھ سات مزدور کام کر رہے تھے۔ اپنے ٹھکے کی جیب دیکھ کر وہ قدرے پریشان ہو گئے۔ ان کا پاس جو ایک بزرگ مزدور تھا ہمارے پاس آگیا۔

”سلام صاحب۔۔۔“

”یہ روڈ ٹھیک ہے؟“

”ٹھیک ہے صاحب۔۔۔“

”کہاں تک ٹھیک ہے؟ دیوسائی تک؟“

”نہیں صاحب۔۔۔ بس یہاں سے تھوڑی دور تک ٹھیک ہے۔ ایک ہفتہ میں

ہم روڈ کلیئر کر دیں گے پھر دنیا جہاں کا جیب اوپر آ جائے گا۔۔۔ آپ واپس چلے جاؤ پھر آ جانا۔۔۔“

ہم دوبارہ جیب میں سوار ہو گئے۔ اور تب کچھ کچھ ذائقہ ہم نے اس کی خطرناکی کا چکھا۔ جیب کے ٹائز کنارے کی جانب کھسکتے اور پھر جیسے ہم لڑھکتے ہوئے پھر واپس آ جاتے۔ ایک مقام پر ایک بڑا پتھر راستے میں پڑا تھا۔ اسے ہم سب نے مل کر ٹالے میں لڑھکایا اور یہ جانا کہ کسی بھی پتھر کو لڑھکاتے ہوئے یہ خیال رکھتے ہیں کہ جب پتھر لڑھکنے کو ہو تو اس سے پرے ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کا ہاتھ اس پر ہو گا تو وہ آپ کو بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کرے گا۔

جیب پہلے جببکی، پھر ایک ہی جگہ پر زور لگانے لگی۔ ہم نیچے اتر گئے۔ راستہ ٹالے میں گرا ہوا تھا اور صرف چند پتھر ایسے تھے جن پر سے ہم قدرے احتیاط سے پیدل گذر سکتے تھے۔ پورٹرز سامان اتارنے لگے۔

یہ جگہ دیوسائی ٹالے کے قریب تھی۔ سامنے دو کشیز نظر آ رہے تھے، ایک تو راستے میں تھا اور ہمیں اسے عبور کرنا تھا اور دوسرا ڈھلوان پر پڑا تھا۔ اس مقام پر ٹالہ تقریباً ہموار چلا آتا تھا اور اس کی گہرائی ان پتھروں کی نصف تھی جو اس میں سے ابھرے نظر آتے تھے اور یہ پتھر زیادہ بڑے نہیں تھے۔ جہاں پتھر تھے وہاں ان سے ٹکرا کر گذرنے والا پانی سفید نظر آتا تھا اور دوسری جگہوں پر وہ ہموار اور آسمانی نیلا تھا۔

پورٹرز علی اور حسین نے اس بکھرے ہوئے سامان کو رسوں کی مدد سے دونوں

رک سیکوں کے اوپر نیچے مضبوطی سے باندھا اور کچھ اشیاء بازوؤں سے لٹکا لیں۔ سامان پہلی نظر میں اتنا زیادہ دکھائی دیتا تھا اور اتنا بکھرا ہوا تھا کہ ہمیں یقین نہ آیا کہ اسے صرف دو رک سیکوں میں سمیٹا جا سکتا ہے اور اسے صرف دو پورٹرز اٹھا سکتے ہیں لیکن جتنی پورٹرز کا یہی کمال ہے۔ آپ اسے پورا گھریک کرنے کو دے دیں اور وہ اپنی کوستانی فراست کو کام میں لاتے ہوئے اسے ایک رک سیک میں پیک کر دے گا۔ اور اسے اٹھا بھی لے گا۔ سلجوق کے پاس ایک چھوٹا سا رک سیک بھی تھا جس میں کیمرو ریڈیو اور چند گرم کپڑے تھے۔ عباسی نے بھی کچھ اشیاء کانڈے پر ڈال لیں، البتہ میرے پاس صرف ایک تنگ تھی۔ ہائینگ بنک اور اس کے سوا مجھے صرف اپنا بوجھ اٹھانا تھا۔

جیب ڈرائیور کو بتایا گیا کہ اسے کل چار بجے اسی مقام پر پہنچنا ہے اور ہر صورت میں پہنچنا ہے اور اگر ہم یہاں نہیں پہنچتے تو فوری طور پر سکرو جا کر قلب علی کو اطلاع کرنا ہے کہ دیوسائی کے مسافر نیچے نہیں اترے۔

یہاں جیب کو واپس موڑنے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ راستہ اتنا چھوٹا تھا کہ اسے موڑا نہیں جا سکتا تھا چنانچہ بہت دور تک بیک کرنے کے بعد عباسی کی ہدایات کے مطابق اسے بمشکل دیوسائی ٹالے میں گرنے سے بچا کر موڑ لیا گیا۔

جیب ڈرائیور نے صدیادہ میں رات بسر کرنا تھی۔ جو نئی جیب نظروں سے اوجھل ہوئی ہم جیسے ایک اجنبی سیارے پر تھے۔ دیوسائی ٹالے کا ہلکا شور۔ اس کی ٹیلا ہٹ۔ ٹالے کے ساتھ چٹانوں میں کھدا ہوا جیب ٹریک جو اوپر ویرانی کی جانب جا رہا تھا اور وہ آسمان جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہاں سے اس آسمان کا بہت چھوٹا سا حصہ پہاڑوں کے اوپر نظر آتا تھا لیکن ہم نے ایسا ٹیلا شیشہ آسمان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس آسمان کو جہاں سنگلاخ چوٹیاں چھوٹی تھیں وہاں سے وہ ٹوٹا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

اور یہاں ایک تیز خوشبو تھی۔ یہ ان پودوں اور جھاڑیوں میں تھی جو دیوسائی ٹالے کے ساتھ جکے ہوئے تھے۔

ہاں ہم جیسے ایک اجنبی سیارے پر تھے اور تنہا تھے۔ پورٹرز نے سامان اپنے جسم پر لاوا اور سر جھکا کر چلنے لگے۔ اور پھر ہم چاروں مناسب فاصلہ دے کر ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے۔ یہ طے تھا کہ کوئی بھی شخص اپنے آپ کو ہمارے اور دوسروں سے باہمت ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

اتنی دور تک چلے گا جتنی دور تک اس کا سانس اس کا ساتھ دیتا ہے اور پھر آرام کرے گا۔ ہم پہاڑوں سے مقابلہ کرتے نہیں آئے ان کی تعلیم کرتے ہوئے انہیں دیکھنے اور محسوس کرنے آئے ہیں۔
دھوپ یہاں بھی تیز تھی۔

میں نے اس جیب روڈ پر پہلا قدم اٹھایا جو دیوسائی کو جاری تھی اور پھر میرے لبوں پر ایک بے اختیار مسکراہٹ پھیلی، میں ایک احتیاط پسند دیوالے کی طرح آہستہ سے ہنسا۔ بالآخر میں دیوسائی کے راستے پر تھا۔
ہم چٹانوں کے سائے میں آرام کرنے کے لئے ٹھہرتے تو فوراً ہی ٹھنڈک محسوس ہوتی۔ اور دھوپ میں شدت تھی۔

دونوں جانب پہاڑ تھے جو بست بلند نہ تھے۔ درمیان میں دیوسائی ٹالہ اور اس کے کنارے کے ساتھ سلجوق لمبی لمبی پلاٹنیں بھرتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ عباسی تھا۔ ان سے پیچھے پورے تھے۔ پھر میرا تھا جو تیز منک والے پھولوں کو غور سے دیکھتا اور پھر چلتا تھا۔

میں میرے بارے میں فکرمند تھا۔ حال ہی میں اس کے مائنسز کا آپریشن ہوا تھا اور سرجن نے ہدایت کی تھی کہ اسے مکمل صحت یابی سے پیشتر زیادہ بلند مقامات پر نہیں جانا چاہئے۔ بظاہر تو وہ اس آپریشن سے شغلیاب ہو چکا تھا لیکن میں پھر بھی فکرمند تھا۔ اس کی صحت کم از کم قاتل رنگ نہ تھی۔

دیوسائی ٹالہ چند دیو زاد چٹانوں میں سے آبشار کی صورت میں نیچے گرتا تھا اور اس کا پانی ایک بڑے تالاب میں جمع ہو کر پھر نیچے جاتا تھا۔

وہ فاصلے کم ہونے لگے جنہیں طے کر کے میں سانس لینے کے لئے رکتا تھا۔ ہوا میں مکمل سانس نہیں لیا جاتا تھا۔ اس میں آکسیجن اتنی کم تھی کہ وہ بار ہوا اندر کھینچنے سے ایک بار کا سانس مکمل ہوتا تھا اور اس کے علاوہ ہوا میں خشکی تھی۔

تمام لوگ مجھ سے بہت آگے نکل گئے۔ اور میں اس مکمل تنہائی میں خوش تھا اور آہستہ آہستہ چلتا تھا اور آسمان میرے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ دیوسائی تک اس راستے کی سب سے بڑی نشانی بھی یہی ہے کہ یہاں آپ آسمان کے قریب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھر جو پہاڑیاں نظر آتی ہیں وہ بھی زیادہ بلند نہیں ہوتیں اور ان کی ڈھلوانوں پر گھاس اور جھاڑیاں نیچے تک آتی ہیں اور اس میں کہیں کہیں انتریم کی شکل کے زرد لے سنوں والے پھول نظر آتے ہیں۔ ان کی منک تو ہوا میں ہمہ وقت

موجود ہوتی ہے لیکن ڈھلوانوں کے قریب وہ جموں کی صورت نیچے آتی ہے۔ ایک ایسی ہی سرسبز ڈھلوان میں زرد اور جامنی پھول چھروں میں سے باہر آتے تھے اور یہاں ان کی منک تیز تھی اور یہیں میں سستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ اس سے آگے راستہ ایک میڑھی کی طرح بلند ہو رہا تھا اور دیوسائی کا ٹالہ اسی حساب سے نیچے گمراہی میں جا رہا تھا۔

عباسی نے پیچھے دیکھا۔ مجھے دور ایک ڈھلوان کے نیچے دیکھا اور وہ ہانپتا ہوا میرے پاس آگیا "سرجی آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟"
"میں عیش کر رہا ہوں عباسی۔" میں نے پاؤں پیار کر اپنے سر کے نیچے بازو کا ٹکیر رکھا اور نلا آسمان جیسے میری آنکھوں پر چھا گیا۔

"یہ بڑی کٹی چڑھائی ہے سرجی۔ یہاں تو جوان لوگوں کو آکسیجن کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ ویسے آپ بالکل ٹھیک ہیں ناں؟" وہ فکرمند تھا، کیونکہ میرے برس اس کے برسوں سے کہیں زیادہ تھے اور اس کا خیال تھا کہ میں اس چڑھائی سے اور مشقت سے بیزار ہو چکا ہوں اور مجھ میں چلنے کی سکت باقی نہیں ہے۔

"دیکھو عباسی۔" میں نے اس موڑ کی جانب اشارہ کیا جو خاصی بلندی پر تھا اور جس پر آسمان جھکا ہوا تھا "وہاں۔ اس سے پرے دیوسائی ہے۔ اور وہاں میں تمہارے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہاں میں نے ہر صورت پہنچ جانا ہے۔ اسی طرح دم لیتے ہوئے اور آرام کرتے ہوئے میں نے پہنچ جانا ہے۔ گلگت سے اسلام آباد جانے والے فوکر جہاز کی گمشدگی سے چند روز پیشتر اس کے پائلٹ کیپٹن زبیر نے مجھ سے کہا تھا کہ تارڑ صاحب دیوسائی ایک ہوس ہے۔ ایک بار دیکھو تو دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ وہاں اگرچہ موت بھی ہے لیکن ایک ایسی تنہائی ہے جو بیان نہیں کی جاسکتی۔"

"کیپٹن زبیر آپ کے دوست تھے؟"

"نہیں۔۔۔ پچھلے برس گلگت جانے کے لئے میں پی آئی اے کے ناردرن ایریا آفس میں گیا اور وہاں زبیدی صاحب نے بتایا کہ ہمارے کیپٹن زبیر کو بھی آوارہ گردی کا بہت شوق ہے۔ آپ کی طرح۔۔۔ اس شام میں نے کیپٹن زبیر کو فون کیا۔ اور پھر تقریباً ہم روزانہ فون پر شمالی علاقوں کے بارے میں اپنے اپنے تجربات بیان کرتے لیکن۔۔۔ عجیب اتفاق ہے ہم مل نہ سکے۔ کبھی ان کی فلائٹ ہوتی اور کبھی میں لاہور واپس آ رہا ہوتا۔ ایک روز طے پایا کہ ہم اگلے ہفتے شام کو ملیں گے اور اکٹھے کھانا

کھائیں گے۔ اور صرف ایک روز پشتر گلگت سے واپسی پر ان کا جواز لاپتہ ہو گیا۔۔۔ بعض اوقات مجھے خیال آتا ہے کہ وہ اکثر دیوسائی پر سے گذر رہا تھا ہو سکتا ہے وہاں اس نے کریش لینڈنگ کی ہو اور وہ ابھی تک۔۔۔

میرے چہرے کا ہینہ خشک ہو چکا تھا اور ہوا سرد لگ رہی تھی۔ میرا بدن ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ "میں بھی دیوسائی کی ہوس میں آیا ہوں اور اسے دیکھے بغیر نہیں جاؤں گا۔ تم چلو۔"

"پانی چاہئے سر۔۔۔"

"ہاں ایک گھونٹ پانی ضرور چاہئے۔۔۔"

عباسی میرے ساتھ ساتھ چلے لگا۔

"نہیں۔۔۔" میں رک گیا "تم آگے چلو۔ تم میرے ذہن پر بوجھ بنو گے۔ میں سوچوں گا تم میری وجہ سے آہستہ چل رہے ہو اور میں اپنی مرضی کے خلاف تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیز چلوں گا اور یہ اچھا نہیں ہو گا۔ تم چلو میں آ جاؤں گا۔"

"سر۔۔۔" عباسی نے مجھے یقیناً مضبوط الحواس جانا کیونکہ اس کی مسکراہٹ یہی کہتی تھی اور پھر وہ چھری ٹیکتا مجھ سے آگے نکل گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ تنہائی میرے لئے کتنی بڑی نعمت ہے۔ میں اس کے لئے کتنا ترستا ہوں۔ بس یہی لمحے ہیں پورے برس میں جن میں میں آزاد ہوتا ہوں اور پورے اور مکمل سانس لیتا ہوں۔ ان لمحوں میں جب اس لٹھک سے بوجھل ہوا میں صرف میں ہوں جو سانس لیتا ہوں یا وہ پرندے جو ان جھاڑیوں اور گھاس میں ہوں گے جو وحلو انوں پر ہے۔ اور میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں۔ کوئی ٹل نہیں، کوئی مسکراہٹ نہیں، میری جیب میں گھر کے "خاندان کے کاموں کی کوئی فہرست نہیں اور مجھے کل کی فکر نہیں۔ میرے ہاتھ میں ایک ڈانگ تنک ہے اور میں اپنی من مرضی سے چل رہا ہوں اور بلندی پر اگنے والے پھولوں کی عجیب سی منک اور دیوسائی ٹالے کا ہلکا سا شور۔

مجھ سے چلا نہیں جا رہا۔ میں پھر بیٹھ جاتا ہوں۔

پانی ختم ہو گیا ہے اور پورز ابھی فلاسک تھامے نیچے ٹالے تک گیا ہے۔

اور میں سے یہ پھر بلا راستہ ایسے اوپر اٹھتا ہے جیسے اس جہاں سے اٹھتا ہے۔۔۔ سلجوق کے قدم اس طرح اٹھ رہے ہیں جیسے وہ کسی زینے پر چڑھ رہا ہے۔

اور یہ نیلے آسمان تک پہنچنے کا زینہ ہے۔

ہمیں اس راستے پر چلنے ہوئے ساڑھے تین گھنٹے گذر چکے تھے۔

آسمان قریب ہو رہا تھا اور ہم آسمان کے قریب ہو رہے تھے۔ منظر ذرا کھلنے لگا تھا۔

پورز علی اور سیر راستے کے ایک بلند موڑ پر کھڑے ہاتھ بلا رہے تھے اور مجھے بلا رہے تھے لیکن فاصلے اور ٹالے کے شور کی وجہ سے ان کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس کے باوجود میں جان گیا کہ ان کی نظریں دیوسائی پر ہیں اور وہ ٹاپ پر پہنچ گئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد سلجوق اور عباسی بھی ان کے پاس پہنچ گئے انہوں نے اوپر پار دیکھا اور پھر مجھے آوازیں دینے لگے اور ان کے آوازیں تیز ہوا کے ساتھ میرے قریب آئیں اور پھر فوراً ہی مدھم ہو جاتیں۔ دیو۔۔۔ سائی۔۔۔ سائی۔۔۔

میں سر جھکا کر چلتا رہا اور زینہ پہ زینہ بلند ہوتے راستے پر چڑھتا رہا۔ اور وہ سب اس موڑ پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ سامنے دیوسائی تھا۔

جہاں ہم تھے وہاں تک پتھر تھے، پتھریلی چٹانیں۔۔۔ لیکن ان کے بعد گھاس کے وسیع نیلے تھے، چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور ان پر کہیں کہیں برف کی ٹکیریں تھیں اور ان میں سے دیوسائی ٹالہ راستہ بناتا آ رہا تھا۔ یہ منظر انگلستان یا سکاٹ لینڈ کی کٹری ساڈ ایسا تھا۔ ان پہاڑیوں میں کہیں بھی کوئی ایک پتھر، ایک جھاڑی یا ایک درخت نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں سوائے گھاس کے، سطح مرتفع میدان کے اور اس پر بھٹکے ہوئے عجیب و غریب شکلوں کے بادلوں کے اور کچھ نہ تھا۔ اور یہاں سے بس یہی کچھ نظر آ رہا تھا۔ اور ہاں اس منظر میں کشش نہ تھی بلکہ ایک دل پر بیٹھنے والے خوف کا خدشہ تھا۔ لیکن اس منظر نے ہمیں حیران کیا۔ اس بلندی پر یہ سرسبز اور وسیع لینڈ کیسے۔۔۔

"یہی دیوسائی ٹاپ ہے؟"

"جی صاحب۔۔۔" علی بولا "ابھی ہم اور چلیں گے تو دیوسائی کے کنارے تک پہنچ جائیں گے۔ وہاں جا کر یہ راستہ ہموار ہو جائے گا۔ اور اوپر صدمہ پارہ گاؤں کی "بنک" ہے۔ پھر اوپر کیپ کر سکتے ہیں۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" میں نے سانس کھینچتے ہوئے کہا "ابھی صرف دو بجے ہیں۔ ہم

مزید تین کھنڈے دیوسائی کے اندر چلیں گے اور پھر یکپ کریں گے۔۔۔

"ابو نیچے نہیں کریں گے؟" سلوکی نے پوچھا۔

اب ہم ساتھ ساتھ چلتے گئے کیونکہ چڑھائی ختم ہو چکی تھی اور جیب روڈ تقریباً ہموار تھی۔۔۔ ہمارے دائیں جانب جو چٹانیں تھیں وہ ختم ہو گئیں اور بائیں جانب منظر وسیع ہوتا گیا اور ہم دیوسائی کے کنارے پر تھے۔۔۔

ایک گرو آلود راستہ پہاڑوں میں دور تک جاتا دکھائی دیتا تھا۔۔۔ اور یہ پہاڑیاں بہت چھوٹی تھیں اور جیسے کوئی ماڈل ہو۔۔۔ اور ہمیں سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔۔۔ ہم دنیا کے بلند ترین میدان میں تھے۔

پورٹرز نے رک سیک اتار کر زمین پر رکھے۔ عباسی نے پرائیوٹ کا پلندہ کھولا۔۔۔ علی نیچے اترا۔۔۔ اور وہاں نیچے ایک بہت بڑی "بنک" تھی جس میں ہزاروں موٹی تھیں، ان میں بھیڑیں اور زوہ شامل تھے۔ چند کوفٹریاں تھیں اور جس علاقے میں موٹی قیام کرتے تھے وہاں زمین چٹیل اور گھاس سے خالی تھی۔۔۔ یہ بینک خاصی دور تھی اور جہاں ہم تھے وہاں سے موٹی چوٹیوں کی طرح رینگتے دکھائی دیتے تھے۔۔۔ میں نے ایک پرائیوٹ پر اچار کی ایک قاش رکھی اور ذرا ہٹ کر گھاس پر بیٹھ گیا۔۔۔ میں تھک چکا تھا اور چند قدم چلنے سے ہانپ گیا تھا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد علی نیچے بینک سے چائے کی ایک کیتلی لے کر آ گیا۔۔۔ یہ دیوسائی کی بہترین چائے تھی لیکن ہم اسے بمشکل نگل سکے کیونکہ اس میں دھواں تھا اور بھیڑوں کا دودھ تھا، ان کے بال تھے اور ان کی بو تھی۔۔۔ یوں بھی ہماری بھوک ختم ہو چکی تھی اور خوراک کو دیکھ کر دل اچاٹ ہوتا تھا۔ بدن اندر سے خالی محسوس ہوتا تھا اور چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے دل ہزار ہوتا تھا۔۔۔ یہ بلندی کا کرشمہ تھا کہ بیٹھے رہیں تصور جانیں گے ہوئے۔۔۔ میں نے علی کو اپنے قریب بلایا "تم دیوسائی کو اچھی طرح جانتے ہو۔۔۔ کیا یہاں کوئی ایسا مقام ہے جہاں سے پورے دیوسائی کا منظر نظر آتا ہو؟"

"جی صاحب۔۔۔ ادھر وہ جو ٹیلا ہے ادھر چوٹی پر سب سے اچھا نظارہ ہے۔۔۔"

"اور کیا ہم وہاں یکپ کر سکتے ہیں؟"

"وہاں تو بہت بہت ہوگی صاحب۔۔۔ آپ دیکھ لو چل کر۔۔۔"

دونوں پورٹرز نے اپنے اپنے بوجھ اٹھائے اور چلنے لگے۔

ہم نے وہی راستہ اختیار کیا جس پر ہم نیچے سے چلتے آئے تھے لیکن علی ہم سے کچھ فاصلے پر ایک ڈھلوان پر اٹکی ہوئی پگڈنڈی پر چلتا جا رہا تھا اور ہم سے پرے ہوتا

جا رہا تھا۔۔۔

ہم اس "بنک" سے ذرا دور ہوئے تو ہمارے سامنے ذرا آہستگی سے دیوسائی کا منظر کھلنے لگا۔ گھاس کے وسیع میدانوں کے آخر میں کناروں پر نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پہاڑ تھے جن پر برہمن تھیں اور ان پر وہی عجیب شکل کے غیر قدرتی بادل تھے۔۔۔ علی ہم سے بہت دور ہمیں اشارے کر رہا تھا کہ ادھر آؤ ادھر آؤ۔۔۔ ادھر ہم جا رہے تھے سر جھکائے، سانس کھینچتے کہ وہ بہت کم آ رہا تھا۔۔۔ مجھ میں ایک سستی اور غنودگی اور بے چینی اترتی تھی اور ایک قدم بھی آگے جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔۔۔

اور یہاں سے دیوسائی کے پھولوں کا آغاز ہوا۔۔۔ ہم جس گھاس پر چل رہے تھے وہ اس میں تھے اور زمین کی سطح کے ساتھ ساتھ تھے۔۔۔ اور دیوسائی کے پھولوں کی طرح ان کی شکل اور رنگ بھی عجیب تھے۔۔۔ اور تب ہم نے دیوسائی کی اس وسعت کو ایک مختلف نظر سے دیکھا جو ہمارے سامنے دور تک سبز تھی، ہموار جھولوں پر اور ٹیلوں پر اور پہاڑیوں پر جہاں جہاں سبز تھا وہاں صرف سبز نہ تھا بلکہ اس میں پھول ہی پھول تھے اور سو رنگ کے تھے اور وہ زمین کے ساتھ تھے اور جہاں ہم تھے وہاں سے نظر نہیں آتے تھے اس لئے دور سے صرف گھاس دکھائی دیتی تھی لیکن وہ ساری وسعت پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔۔۔ میں ہر قدم پر بیٹھ جاتا اور ان کے وہ چہرے دیکھتا جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔۔۔ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر جو پھول ہوں گے وہ صرف اس نے دیکھے ہوں گے جو اتنی بلندی پر گیا ہو۔۔۔ اور صرف بلندی پر نہیں کیونکہ یوں تو وہ خنجراب سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے لیکن وہاں بھی پھولوں کی یہ قسمیں دکھائی نہیں دیتیں۔۔۔ یہ پھول نہ صرف یہ کہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہوتے ہیں بلکہ صرف سطح مرتفع دیوسائی پر ہی ہوتے ہیں چنانچہ میں ان کی شکلیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ کہیں یہ جھاڑیوں میں تھے۔۔۔ اور جھاڑیاں بھی گھاس جتنی ہی تھیں چھوٹی چھوٹی اور گھاس کے ساتھ پھیلی ہوئیں۔۔۔ کہیں یہ کچھوں میں تھے اور کہیں مختلف رنگوں کے لائبے ڈھیلے جو ہوا کے زور سے دوہرے ہوتے تھے۔۔۔ میں نے زمین پر لیٹ کر ان کی جو تصاویر اتاریں انہیں دیکھ کر اکثر لوگوں نے کہا کہ یہ تو کسی جاپانی باغ کی طرح منصوبہ بندی کے ساتھ لگائے گئے ہیں۔۔۔ ان میں سے ایک سرخ پھول تھا جو عمل کی طرح تھا اور زمین پر ڈھیر ہوتا تھا۔۔۔

ہم ذرا جھجک کر چلتے تھے اور ہمارے قدم بے دہل ہوتے تھے کیونکہ ہم پھولوں کو پاؤں تلے مسلتا نہیں چاہتے تھے۔۔۔ لیکن ایسا ناممکن تھا۔۔۔ ہمیں پھولوں پر ہی چلنا

تھا۔

ہم پانچوں ایک قطار میں چل رہے تھے۔
 "ابو۔۔۔" میرے پیچھے سے میرا بازو پکڑ لیا۔۔۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔۔۔ "ابو میری طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔"
 میں نے اس کا ہاتھ اور گال چھوئے تو وہ گرم تھے۔۔۔ یکدم مجھ میں خوف اتر گیا۔۔۔ "کیا بات ہے؟"
 "بس چلنے کو جی نہیں چاہتا اور سر میں درد ہو رہا ہے۔۔۔ مجھے جیکٹ نکال دیں۔۔۔"

میں نے حسین کو بلایا اور رک سیک کھول کر سوئیٹر اور ایک افغانی جیکٹ میر کو پہنا دی۔۔۔ اور ایک سفید اونٹنی ٹوپی بھی۔۔۔ جو سیاچین جانے والے سپاہی پہنتے ہیں۔۔۔ ہم سب نے گرم کپڑے پہن لئے۔۔۔ سردی زیادہ ہو رہی تھی۔
 ہم پھر چلنے لگے۔۔۔ لیکن میرے اندر میر کی بیماری کا خوف تھا۔۔۔ دیوسائی کا خوف تھا۔۔۔ عباسی اوپر پہنچ چکا تھا۔۔۔ اس نے ہاتھ بلایا۔
 اور پھر ہم سب اس علاقے کے بلند ترین ٹیلے کی چوٹی پر تھے۔

ہمارے سامنے پورا دیوسائی تھا۔۔۔ یہاں سے وہاں تک۔۔۔ اس کے دریا بھی اور ٹالے بھی اور وہ جیب ٹریک بھی جو دور دور تک جاتا تھا اور گرم ہوتا تھا۔ اور وہ ٹیلے پہاڑ اور ان پر جھکے ہوئے عجیب بادل بھی۔۔۔ اور یہاں بھی لاسے اور ٹھنڈے ایسے پھول تھے اور یہاں ایک تصویر اتاری تو اس میں یوں لگتا ہے جیسے میر اور سلجوق ایک کیاری میں کھڑے ہیں اور ان کے پیچھے ایک پردہ ہے جس پر ایک ٹل کھاتا دریا ہے اور دیوسائی کی سرسبز وسعت ہے جس پر کہیں دھوپ ہے اور کہیں سایہ ہے اور۔۔۔ کہیں بھی ایک درخت نہیں، بھاڑی نہیں، پتھر نہیں۔۔۔ صرف سبز ٹیلے اور میدان ہیں۔۔۔ اور اس وسعت میں ہمارے علاوہ اور کوئی نہیں۔۔۔ اور تیز سرد ہوا ہے جس میں ہم ہیکٹوں میں ہاتھ ڈالے ذرا جھکے ہوئے کھڑے ہیں اور ہوا کی تیزی سے ہماری آنکھوں میں پانی تیرتا ہے۔۔۔ ہم اکیلے ہیں۔

"واہ واہ۔۔۔" سلجوق نے چٹکارہ لے کر کہا اور پھر اپنے تھیلے میں سے ریڈیو نکالا اس کا ایریل کھینچ کر لمبا کیا اور سوئی گھمانے لگا۔۔۔ "یہاں اس بلندی پر دنیا کے سب سٹیشن لاؤڈ اور کلیئر آئیں گے۔۔۔" وہ سوئی گھماتا رہا لیکن سوائے ایک چینی ریڈیو سٹیشن کے اور کوئی آواز ہاتھ نہ آئی اور سلجوق جو ریڈیو کے شارٹ ویو کا بہت

شیدائی ہے یہ ریڈیو صرف اس لئے یہاں تک اٹھا کر لایا تھا کہ وہاں بلندی پر۔۔۔ اور یہاں وہ کچھ بھی نہ پکڑ سکا۔۔۔ "بھٹے منہ بجی۔۔۔" اس نے ایریل کو دھپ مار کر سمیٹا اور ریڈیو بند کر کے تھیلے میں ڈال دیا۔

"ابو۔۔۔ میری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔۔۔" میر نے کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں بہت سرخ تھیں اور آواز میں کپکپاہٹ تھی۔
 ہمارے پاس پانی بھی تھا اور گلوکوز بھی۔۔۔ ایک بڑا ٹمک میر کو تیار کر کے پلایا لیکن اس کی صحت بحال نہ ہوئی۔

"بھائی کو خیمہ لگا کر اس میں ڈال دو۔۔۔" پورٹر علی نے میر کو فکر مندی سے دیکھا۔

"یہاں خیمہ لگائیں؟"

"نہیں صاحب ہوا ہو گی اور پانی ادھر سے دور ہو گا۔۔۔"

"پانی کدھر ہے؟"

"وہ نیچے۔۔۔" اس نے آگے بڑھ کر بتایا۔ ٹیلے سے نیچے۔۔۔ کافی دور ایک چھوٹی سی جمیل تھی اور اس کے ساتھ ایک بلند گھاس میں پوشیدہ رواں پانی تھا جو یہاں سے دکھائی نہیں دیتا تھا "وہ اچھی جگہ ہے۔۔۔"

تم جلدی سے نیچے پہنچو اور خیمہ لگاؤ۔۔۔ ہم آتے ہیں۔۔۔ میر تمہیں سہارے کی ضرورت ہے؟

"اوہ نہیں ابو۔۔۔" وہ لاپرواہی سے اترنے لگا۔ وہ یقیناً ایک بہادر بچہ تھا۔

اس بلندی پر کچھ پتھر تھے اور کسی آبادگاہ کے آثار تھے۔۔۔ شنید ہے کہ اے کی جنگ کے دوران انڈیا دیوسائی میدان پر اپنی ہیرا فوج اتارنا چاہتا تھا اور انہیں روکنے کے لئے پاک فوج نے یہاں عارضی مورچے قائم کئے تھے۔ اور ظاہر ہے ایک ایسی جگہ قائم کئے تھے جہاں سے پورا دیوسائی نظر آتا تھا۔

"سر ہم یہاں دوبارہ آئیں گے۔۔۔" عباسی پر بھی دیوسائی کے اس منظر کا گہرا اثر تھا۔

"ٹھیک ہے کل صبح پھر آئیں گے۔۔۔"

ہم نیچے اترنے لگے۔ میر آگے آگے چل رہا تھا لیکن اس کی چال میں مکمل توازن نہیں تھا۔ ہم نیچے پہنچے تو علی پہلا خیمہ استادہ کر چکا تھا۔ میر ڈھلکے ہوئے پھندے والی سفید ٹوپی میں سر جھکائے ایک رک سیک پر بیٹھا تھا، اس کی آنکھیں

بدستور سرفنی میں تھیں اور وہ منہ کھول کر سانس لے رہا تھا۔

سلمان مکمل طور پر کھلا تو معلوم ہوا کہ ہم سب کچھ لائے ہیں خوراک لائے ہیں لیکن اس خوراک کو پکانے کے لئے برتن نہیں لائے اور نہ ہی ہمارے پاس مٹی کے قتل کا چولہا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم دیوسائی کے میدان سے لکڑی چن لیں گے اور اسے جلا کر کھانا پکائیں گے اور یہاں سے قریب ترین درخت ادھر نیچے صد پارہ میں ہو گا اور ادھر چلم چوکی کے آس پاس ہو گا تو لکڑی کہاں سے آئے گی۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے دونوں پورٹر علی اور حسین سر جھکائے گھاس کو دیکھتے تھے اور ادھر ادھر گھومتے تھے۔ حالانکہ ہم دیکھ سکتے تھے کہ وہاں نہ تو لکڑی ہے اور نہ ہی کھانا پکانے کے برتن نکھرے ہوئے ہیں۔

ہم جمیل کے کنارے خیمہ زن تھے لیکن یہ دراصل ایک بڑا تالاب تھا اور اس کے کچھ آلود کناروں پر مویشیوں کی آمدورفت کے نشان تھے۔

علی اور حسین اپنی تلاش میں دور چلے گئے تھے۔

”سرفنی یہ پورٹر بالکل پائل خائے ہیں، لکڑی اور برتن تلاش کر رہے ہیں۔“ عباسی کہنے لگا اور وہ بے حد تھکا ہوا نظر آتا تھا۔ ”ویسے سرفنی آپ ماہنڈ نہ کرنا۔ مجھے بالکل امید نہ تھی کہ آپ تک پہنچ جائیں گے۔“

علی اور حسین لدے پھند۔ ”ہاں آ رہے تھے۔“

”صاحب ہم کو یہ کچھ گوبر ملا ہے اس کا آگ بنائے گا۔“ علی نے اپنے کھیل کو زمین پر الٹا دیا۔

”اور صاحب یہ برتن ہے۔ ابھی صاف کریں گے تو ٹھیک ہو جائے گا۔“ حسین کے پاس تین خالی زنگ آلود ٹین تھے جو وہ نیلے کی اس چوٹی سے لایا تھا جہاں کسی زمانے میں فوج نے قیام کیا تھا۔“

اس دوران میں نے اور عباسی نے ایک خیمے کے اندر سیلینگ بیگ بچھا کر میر کو اس میں بالکل پیک کر دیا تھا۔ وہ بار بار پکارتا ”ابو میں بھی باہر آ جاؤں۔“ کیونکہ دیوسائی میں ہونا اور دیوسائی کو نہ دیکھنا اس کے لئے بے حد اذیت ناک تھا۔

گوبر دھواں دینے لگا۔ اور اس پر صاف کیا ہوا ایک پرانا ٹین بجتی دیر میں تھوڑا سا گرم ہوتا تھا اس سے بہت جلدی پھر لھٹا ہو جاتا تھا۔ ہم اس کے گرد سر جھکائے بیٹھے تھے اور شام کی رخ بنگلی جو آنے کو تھی اسے ابھی سے اپنے بدنوں میں اترتے محسوس کرتے تھے۔ چائے بالاخر تیار ہوئی اور ہم نے میر کو ڈسپرن کی دو

گولیاں کھلائیں اور اس پر سے گرم چائے کا ایک مک اسے اندر اندر پلٹنے کو کہا کیونکہ وہ چائے کا شوقین نہ تھا۔

ہم دھواں دیتے گوبر پر ہتھیلیاں پھیلائے بیٹھے رہے۔

اس بلندی پر سانس کی بے چینی بھی بہت تھی اور اس میں میر کی بیماری کی بے چینی کھلتی تھی اور اسے تقریباً ناقابل برداشت بناتی تھی۔ ابھی سورج تھا، شام ہوتی تھی اور پھر رات اور دیوسائی کی رات۔ اور اگر اس رات ہمیں کوئی ایمر جنسی ہو گئی تو ہم کیا کریں گے؟ اس کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے سوائے انتظار کے۔ صبح کا انتظار اور روشنی کا انتظار۔ میں ہر پانچ منٹ بعد خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر جھانکتا۔ وہ کبھی سو جھی ہوئی آنکھوں کو کھول کر بمشکل مسکراتے کی کوشش کرتا اور کبھی اس کی آنکھیں بند ہوتیں اور وہ کھلے منہ سے سانس لے رہا ہوتا۔ اس کا رنگ بہت سرخ ہو رہا تھا۔

ہم نے ملک پاؤڈر سے دودھ بنایا اور اسے گرم کر کے میر کو پلایا۔ اسے خیمہ آنے لگی۔

ہم دھواں دیتے گوبر پر ہتھیلیاں پھیلائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور ایک دم ایک سیاہ دھند کی طرح ایک چھوٹے سے بادل کی طرح ہمارے آس پاس چھری چھری تھیں اور ان کا سائز تقریباً کمپی جتنا تھا۔ وہ ایک بڑی دل کی طرح ہم پر بیٹھنے لگی اور ہم نے فوراً اپنے چروں کو ٹوپیوں اور رومالوں سے ڈھانپا اور گردنیں نیچی کر کے اپنے آپ کو بچانے لگے۔ ہم نہ ایک دوسرے کی جانب دیکھ سکتے تھے اور نہ کچھ کر سکتے تھے۔

”علی۔۔۔ یہ کیا مصیبت ہے بھی؟“ عباسی ہوا میں ہاتھ کی ٹکواریں چلا رہا تھا اور بے حد ٹھٹھے میں تھا۔

”یہ صاحب زیادہ دیر نہیں رہے گا۔۔۔ ابھی ہوا بند ہوا ہے اس لئے آیا ہے۔ ابھی ہوا چلے گا تو یہ چلا جائے گا“ انتظار کرو۔“

شاید دس منٹ تک ہم یوں سر جھکائے بیٹھے رہے اور پھر ہوا آگئی اور وہ سب کے سب چلے گئے ان میں سے ایک بھی باقی نہ رہا اور ہم نے رومال اور ٹوپیوں وغیرہ اتار کر لمبے لمبے سانس لئے۔ اور یہ جو ہوا تھی پہلے کی نسبت زیادہ سرد تھی کیونکہ سورج ڈھل رہا تھا۔ اور سردی نہ در نہ صاف آسمان سے نیچے آ رہی تھی۔

ہماری خیمہ گاہ کے ایک جانب جمیل تھی اور دوسری جانب ایک کچا راستہ دور

یہ ابتدائے آفرینش سے ویران اور بے آباد ہے۔۔۔ تو پھر اسے کس لئے بنایا گیا ہے؟ چند چرواہوں کے لئے؟۔۔۔ چھروں کے لئے۔۔۔ ریچھوں کے لئے۔۔۔ یا پھر پھولوں کے لئے۔۔۔ شاید ان چند آوارہ گردوں کے لئے جو جان جو کھم میں ڈال کر یہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔۔۔ میرا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں چند مقامات ایسے دشت نوروں کے لئے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں جن کے بارے میں غالب نے کہا تھا۔

اللہ رے ذوق دشت نوروی کہ بعد مرگ
ہلے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

دشت نور اگرچہ معاشرے کے لئے بے کار لوگ ہوتے ہیں۔ وہ قیام تو اسی مکان میں کیا کرتے ہیں لیکن وہ دیکھتے ہمہ وقت کہیں اور ہیں۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال سے آگمی رکھتے ہیں، صرف وہی اس کی عظمت سے واقف ہوتے ہیں کیونکہ صرف انہوں نے ہی اس کی عظمتوں کو دیکھا ہوتا ہے۔ ایک بڑے کاروباری مرکز میں بند ایک کاروباری کو یا ایک دفتر میں قید ایک بڑے افسر کو کیا پتہ کہ رب نے کیا بنایا ہے اور کیسا کیسا بنایا ہے۔ اور اگر وہ ان جگہوں پر پہنچ بھی جاتا ہے تو وہ انہیں دیکھتا نہیں کہ اس کی آنکھیں وہیں رہ جاتی ہیں اس کے کاروبار میں اس کی ملازمت اور پیشے میں۔ اور یہ صرف آوارہ گرد ہوتا ہے جو اس کی کسی نعمت کو نہیں سمجھتا۔

اس شام جب دیوسائی میدان میں چلتے ہوئے سانس پھولتا تھا اور بت آگے سلجوق اور عباسی تھے اور کہیں پیچھے جمیل کے کنارے خیمے میں میر غفار آلودہ حالت میں اونگھتا تھا میں نے اس مکمل تنائی اور ویرانی کو محسوس کیا جو اتنی ہی بڑی تھی جتنی بڑی وہ تنائی اور ویرانی تھی جو عمر کے ساتھ ساتھ میرے اندر آنسو کی طرح پھیلتی جا رہی تھی۔ شاید آخر میں یہی ہوتا ہے کہ باہر اور اندر کی تنائی اور ویرانی ایک ہو جاتی ہے۔ شاید آخر میں یہی ہوتا ہے۔

ہمیں واپس جانا چاہئے تھا، میر کا پتہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔
سلجوق رکا ہوا تھا اور عباسی میرا منتظر تھا۔

”ابو ذرا سو گئیں۔۔۔ اور ایسے بو آ رہی ہے جیسے لاہور کے چڑیا گھر میں ریچھوں کے پنجرے کے قریب سے آتی ہے۔۔۔ شاید یہ ریچھوں کی پانی کی بو ہے۔۔۔“

تک جانا تھا۔ اس پر جیب بھی چل سکتی تھی اور اس راستے کے دونوں جانب بلند ٹیلے تھے۔ خیموں سے کچھ دور گھاس میں ایک چھوٹی سی ندی رواں تھی۔ اور یہ پتہ نہیں کہاں سے آ رہی تھی اور کہاں جا رہی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر خیمے میں جھانکا۔۔۔ سمیر خیمہ میں تھا۔۔۔ ”اس کا خیال رکھنا۔۔۔“ میں نے علی سے کہا۔۔۔ ”آؤ سلجوق ذرا دیوسائی کی سیر کرتے ہیں۔۔۔“

”سریجی ہم بھی آجائیں؟“ عباسی نے ہاتھ اٹھا کر چھوٹے بچوں کی طرح اجازت طلب کی۔

ہم تینوں اس کچے راستے پر چلتے گئے۔ اس کے دونوں جانب گھاس تھی اور زمین بوس جھاڑیاں اور یہاں صرف زرد اور سفید پھول تھے۔ اور یا پھر ان پھولوں کے خالی ڈھلے جو ایک ماہ پیشتر کھل کر خزاں رسیدہ ہو چکے تھے، یہ لمبے ڈھلے والے پھول سچ سے نہیں بلکہ بلب سے پیدا ہونے والے تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں ایسے چند بلب یا پیاز اپنے ساتھ کھود کر لے جاؤں اور لاہور کاشت کروں۔ میں بار بار مڑ کر اپنی خیمہ گاہ کو تنکا تھا اور ہائیں ہاتھ جو نیلا خیمہ تھا اس میں میر تھا۔ علی اور حسین اس دھوئیں پر جھکے دکھائی دیتے رہے جو گور میں سے اٹھتا تھا۔ اور بہت دیر تک دکھائی دیتے رہے۔

عباسی اور سلجوق مجھ سے آگے نکل گئے۔ اور میں نے ایک بار پھر دیوسائی کی اس تنائی کو محسوس کیا جو کائنات کی تخلیق کے اور ”کن فیکون“ کے لمحے میں وجود میں آئی تھی اور ابھی تک قائم تھی۔ سورج نیچے جا چکا تھا۔ لیکن ابھی دھوپ تھی۔ کیونکہ وہ اس ٹیلے کے پیچھے گیا تھا جس کی چوٹی سے ہم نے دیوسائی کا نظارہ کیا تھا۔ اور سورج جب بھی دیوسائی سے ڈھلتا تھا اور یہاں تاریکی ہوتی تھی تو اس لمحے نیچے سکر دو یا استور میں وہ ابھی روشنی دیتا تھا۔ عباسی اور سلجوق مجھ سے بہت آگے جا چکے تھے اور کم روشنی کی وجہ سے وہ بھی دکھائی دے جاتے اور کبھی دھندلکے میں گم ہو جاتے۔

دیوسائی ایک غیر دستاوردیہ رکھنے والا میدان مشہور تھا۔ اس کی بلندی وسعت اور موسموں کی بے اعتباری نے اسے آج تک تیار رکھا ہے۔ گرمیوں کے دو ماہ میں اس کے کناروں پر لوگ اپنے مویشیوں کو چرانے آتے ہیں لیکن اس کے اندر نہیں جاتے۔ یا پھر آزاد کشمیر کی جانب سے بکروال اور گوجر لوگ آتے ہیں اور اسے عبور کر کے سکر دو جاتے ہیں۔ باقی سارا سال یہ ویران اور بے آباد رہتا ہے۔

ہوا میں یقیناً وہ بو تھی۔۔۔ اور یہ بو ریچھ کی تھی۔

"سر ہمیں واپس جانا چاہیے۔۔۔" عباسی نے فوراً کہا "سلجوق درست کہتا ہے۔۔۔ اس پاس کہیں ریچھ ہیں"

"میں نے علی سے ریچھوں کے بارے میں پوچھا تھا اور وہ کہتا تھا کہ ان دونوں ریچھ ادھر برف کے پہاڑوں کے دامن میں ہوتے ہیں ادھر نہیں آتے۔۔۔"

"وہاں سے یہاں تک کا فاصلہ کتنا ہے سر؟ تین یا چار کلومیٹر۔ کیا پتہ رات کو آجاتے ہوں۔۔۔"

ہم ہانپتے ہوئے تیز چلتے گئے۔ ہم نے اس وارنک کو سنجیدگی سے لیا کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی ریچھ کے تذکرے پر "چاچا ریچھ" کہہ کر مسکرایا نہیں اور نہ ہی دوسرے کو بزدلی کا طعنہ دیا۔ بلکہ ہم خامسے خوفزدہ تھے۔ صرف تین روز بعد بحیر عباسی سرکاری ڈیوٹی پر دیو سائی کے اوپر ایک بلی کاپڑ میں پرواز کر رہے تھے جب انہوں نے اس جمیل سے صرف ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ایک مادہ ریچھ اور اس کے دو بچوں کو دیکھا جو بلی کاپڑ سے خوفزدہ ہو کر اس کے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔ یہ وہی سپاٹ تھا جہاں سے ہم اپنے کیمپ کو واپس ہوئے تھے۔

کیمپ واپس پہنچنے پر میں نے خیمے کے اندر بھانکا۔ لائین کی روشنی میں میرا ایک سفید سیلینگ بیگ میں سو رہا تھا۔ "اب کیسی طبیعت ہے بیٹے؟" میں نے سرگوشی کی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں "بس ٹھیک ہوں۔"

میں جھک کر اندر چلا گیا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ بخار اتر چکا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے تمام بوجھ اتر گئے۔ "کچھ کھاؤ گے بیٹے؟"

"نہیں جی نہیں چاہتا۔"

اور کھانے کو کس کا جی چاہ رہا تھا۔ بس وہی بے چینی اور دیرانی۔

"کہاں گئے تھے؟"

میں نے اسے ریچھ کی بو کے بارے میں بتایا۔

"ابو۔۔۔" میرے سوکھے ہوئے لب نیم مسکراہٹ میں کھلے "مگر وہ رات کے وقت آگئے تو؟"

"میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔۔۔" میں نے اس کی پیشانی سے ہالوں کو ہٹایا۔

"صاحب کھانا کیا کھائے گا؟" علی نے خیمے میں بھانکا۔

"میں باہر آتا ہوں۔"

باہر دیو سائی کی رات کے ساتھ ایک برقی موجودگی اترتی تھی اور ہر شے کو برف کرتی تھی۔ حسین اور عباسی ایلوں کی مدد مٹا کر بجھکے ہوئے تھے۔

"میں تو کچھ نہیں کھاؤں گا۔ ایک مک کانٹا اور کچھ بسکٹ۔"

"سر جی۔۔۔ دو چار پر اٹھے نہ ہو جائیں؟۔۔۔ ابھی تو ہمیں کے قریب باقی ہیں"

"جی نہیں چاہتا۔" میں نے عباسی کی جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں سرخ اور بہت شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے آگے ہو کر اس کی پیشانی پر ہتھیلی رکھی۔ وہ بخار کی حالت میں تھا۔ اس پر بھی بلندی کا اثر ہو چکا تھا لیکن وہ ایک سپاہی کی حیثیت سے اسے خاطر میں نہیں لا رہا تھا "پتلے بحیر صاحب اپنے خیمے میں۔ ابھی کانٹا کے ساتھ دو گولیاں ڈسپرن۔"

"نہیں سر۔ کچھ نہیں ہوتا۔"

"اچھے فوجی ہو لیڈر کا اور ستیر کا حکم نہیں مانتے؟"

"سر۔۔۔" وہ اٹھائیں شن ہوا اور پھر اپنے خیمے میں چلا گیا جہاں سلجوق اپنے ریڈیو پر کوئی سٹیشن کیچ کر نے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب مغربی موسیقی کی ایک دھن خیمے میں سے چمن کر دیو سائی کی سرد ہوا میں آتی تھی اور ٹھنڈی ہوتی تھی۔

"علی۔۔۔ ادھر جو ریچھ ہوتا ہے وہ خیمے کی طرف بھی آجاتا ہے؟"

"ہاں صاحب آجاتا ہے"

"تو کیا بندوبست ہونا چاہیے؟"

"آپ فکر نہ کریں صاحب۔ ایک دو چتر ملا ہے اور پھر ہم نے یہ ٹین اور کچھ برتن وغیرہ باہر رکھا ہے اسے بھانے سے بھاگ جائے گا۔"

"بچے ساتھ ہیں تو ذرا رات کو خیال رکھنا۔"

"کوئی بچے صاحب؟" علی ذرا حیران ہوا۔

"سلجوق اور میر۔"

"صاحب آپ کیا بولتے ہو۔ وہ تو جوان ہیں شادی بنانے کے لائق ہیں۔" علی

ہنسلا۔

"علی۔۔۔ میر کا بخار اتر گیا ہے لیکن اس کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں۔ سر درد

بھی ہے۔ تو کیا بلندی پر ایسا ہی ہوتا ہے؟
 ”ہاں صاحب۔ رات کو بخار کم ہو جاتا ہے، کل ہم نیچے جائیں گے تو صاحب بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

”خطرے کا بات تو نہیں۔؟“

علی تھوڑی دیر کے لئے چپ ہوا اور پھر بولا ”صاحب ادھر ہائٹ پر کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ لیکن آپ فکر نہ کرو کچھ نہیں ہو گا۔“

سلجوق اور عباسی کے خیمے میں سے موسیقی اور قہقہوں کی آواز آرہی تھی۔

گوبر کی آگ تھوڑی ہی دیر میں بالکل ٹھنڈی ہو گئی۔ لیکن کافی تیار ہو چکی تھی۔ اس سے پشتر میر کو ایک گم گرم دودھ پلایا گیا تھا۔

باہر کھلی فضا میں بیٹھنا ناممکن ہو رہا تھا۔ علی اور حسین اپنے کمبلوں میں لپٹ کر رک سیکوں سے ٹیک لگائے چپ بیٹھے تھے۔ میں نے ملتی پورٹوں میں ایک عجیب وصف دیکھا تھا، وہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھے رہیں گے اور پھروں چپ رہیں گے۔ میں نے خیمے کے اندر جانے سے پشتر ایک مرتبہ پھر علی کو رات کے وقت چوکنا رہنے کی تلقین کی۔

رات اندھیری تھی۔ اگر دیو سائی پر پورا چاند ہوتا تو وہ بھی ایک منظر ہوتا۔ یا شاید وہ چاندنی بھی خوف سے بوجھل ہوتی۔

میں خیمے کے اندر چلا گیا۔ سیلینگ بیک میں داخل ہو کر میں نے اپنے آپ کو زپیں چڑھا کر اچھی طرح پیک کر لیا۔

”سوری ابو۔ میں تیار ہو گیا اور آپ کو پریشانی ہوئی۔“

”اوسے نہیں۔“ میں نے اس کے رخساروں کو تھپکا اس کے ماتھے کو چوما۔

تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ سیلینگ بیک جو مکمل طور پر ایئر ہائٹ ہے اور میں جو افغانی جیکٹ اور گرم جرابوں سمیت اس میں مقیم ہوں تو اتنے لمبوسات ضروری نہیں۔ چنانچہ میں نے بمشکل اپنے آپ کو باہر نکالا، جیکٹ اور جرابیں اتار کر ایک جانب رکھیں اور اپنے آپ کو پھر سے سیلینگ بیک میں پیک کر لیا۔

سردی حسب توقع ایسی تھی کہ پورے بدن میں سے صرف چہرہ سیلینگ بیک کے باہر تھا اور کانوں تک اونٹی ٹوپی تھی لیکن آنکھیں ناک اور ہونٹ باقاعدہ کھپکپا رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ صرف چہرے کو کسی ڈیپ فریزر میں رکھا گیا ہے۔

چند لمحوں کے بعد احساس ہوا کہ بلندی کا کچھ اثر مجھ پر بھی ہو رہا ہے اور سر میں درد کی ایک لہر ہے جو کبھی شدت سے آتی ہے اور کبھی پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ سانس لینے میں بھی مزید دشواری پیش آرہی تھی اور طبیعت میں بے چینی تو تھی۔ میں ایک مرتبہ پھر بمشکل اٹھا اپنے آپ کو بیک میں سے نکالا۔ دیا سلائی جلا کر ڈسپرن کی گولیاں تلاش کیں اور بخ بست پانی سے انہیں حلق میں اتار کر پھر سے لیٹ گیا۔

باہر جو ہلکی ہوا تھی اس میں کسی چیز یا جانور کی آواز آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی برابر کے خیمے سے عباسی کی آواز آئی ”سرتی یہ کیا بولا ہے؟“

”پتہ نہیں۔“

”آپ نے کبھی ریتچہ کو سنا ہے کہ وہ کیسے بولتا ہے؟“

”نہیں۔“

”تو پھر پورٹرز کو کہیں کہ وہ ذرا دھیان رکھیں۔ کچھ بولا ضرور ہے۔“

وہ ایک بے چین اور بے آرام رات تھی جو دیو سائی پر گزری۔ سانس لینے میں ہمہ وقت دقت ہوتی رہی۔ ایک بست بڑی مشکل تب پیش آئی جب میں کوٹ بدل کر چہرہ دوسری جانب کرتا۔ صرف کوٹ بدلنے کے عمل کے نتیجے میں سانس پھول جاتا اور خاصی دیر کے بعد درست ہوتا۔ یوں کوٹ بدلنے سے پشتر میں اپنے آپ کو تیار کرتا۔ سردی میں کمی تو ہو گئی لیکن بے چینی بدستور تھی اور۔۔۔ بلندی کا ایک اور کرشمہ بھی تھا کہ بے خوابی تھی۔ نیند نہیں آتی تھی۔

تو وہ ایک بے چین اور بے آرام رات تھی جو دیو سائی پر گزری۔

رات کے پچھلے پھر چند لمحوں کے لئے تھکاوٹ نے غلبہ پایا اور میری آنکھ لگ گئی۔ صرف چند لمحوں کے لئے اور پھر میں نے آنکھ کھولی تو باہر روشنی تھی اور پورٹر اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ ذرا دھیمی آواز میں تاکہ ہماری نیند میں خلل نہ آئے۔

میں اپنے بیک میں سے کھٹک کر باہر آ گیا۔ رات میر گمری نیند سویا تھا اور وہ اب بھی خواب میں تھا۔

باہر دیو سائی کے کناروں پر صبح کی دھوپ تھی۔

”کافی صاحب۔؟“ علی نے پوچھا۔

”ہاں۔ تم دونوں باہری سوئے رہے۔ نیند آگئی تھی؟“
 ”ہاں صاحب۔“ حسین بولا ”اتنی سردی نہ تھی۔“
 ”اور کتنی سردی چاہئے تمہیں؟“

”صاحب یہ چند روز ہزار ہے اور ہم بیس ہزار پر بھی باہر سو سکتے ہیں۔ اور صرف یہ بہت زیادہ ہے۔“ کیا بہت زیادہ ہے، حسین نے اپنا کیل باقاعدہ نچوڑ کر بتایا کہ اور اس بہت زیادہ ہے۔

”گڈ مارننگ سر۔“ عباسی اپنے خیمے میں سے باہر آیا ”آہ کیا خوبصورت صبح ہے۔“ اس نے ایک نیم انگڑائی لی ”تارڑ صاحب کیا اس وقت صرف ہم اس پورے دیوسائی میدان پر صرف ہم یہ صبح دیکھ رہے ہیں۔ کوئی اور تو نہیں؟“

”اگر اس وقت یہاں کوئی اور ہے تو وہ صرف دیکھ ہو سکتے ہیں۔“
 ”آپ یقین نہیں کریں گے۔“ عباسی میرے قریب آکر آنکھیں جھپکتے ہوئے بولا ”رات کو اور دیکھ آیا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو وہ خالی ٹینوں کو سو گھ رہا تھا۔ یقین کیجئے۔“

”وہ میں تھا صاحب۔“ حسین ذرا شرمندہ سا ہوا ”رات کو مجھے خیال آیا کہ جن ٹینوں میں ہم چائے وغیرہ بناتے ہیں وہ خیمے کے بالکل ساتھ پڑے ہوئے ہیں اور اگر آپ کوٹ بدلو گے تو شاید وہ آپ کے نیچے آجائیں اس لئے میں نے بہت آرام سے انہیں اٹھالیا۔“

”حسین۔“ عباسی ہنسنے لگا ”تمہارا کیا بگڑتا اگر میں ساری عمر اس یقین میں گزار دیتا کہ دیوسائی کی ایک رات میں ایک دیکھ میرے خیمے کے پاس سیر کرتا تھا۔“

کافی کے مک گرم تھے اور ہم انہیں تمام کران کی گرمی محسوس کرتے اہلوں کے دھوپ کے پاس بیٹھ گئے۔

دیوسائی کے کناروں پر بالوں کے ٹکڑے تھے اور ہلکی ہوا تھی۔

”صاحب کس ٹائم اترتا ہے؟“ علی پوچھنے لگا۔

”دوپہر کے کھانے کے بعد۔“

”تارڑ صاحب کچھ موڈ ہے دیوسائی میں سیر کرنے کا۔؟“

کل جب ہم اس جمیل کنارے پہنچے تھے تو میں نے اس پہاڑی کو دیکھا تھا جو

دھیرے دھیرے بلند ہوتی تھی اور اس کے عقب میں دیوسائی کا کوئی اور منظر تھا۔
 ”ہم اوپر جا رہے ہیں، بچوں کا خیال رکھنا۔“ حسین نے سنا اور مسکرا کر سر ہلایا دیا۔

ہم اپنی چھڑیاں ٹپکتے چلنے لگے۔ چھوٹی ندی کو پھلانگنے سے چٹھڑ میں نے اس کے پانی سے منہ ہاتھ دھوئے کی ایک نیم دھانہ کو شش کی۔ اور فوراً ترک کر دی۔

ہم اپنی خیمہ گاہ سے ذرا دور ہوئے تو پھر وہی لمبے ڈھل والے پھول، ننھے ننھے پھولوں سے ڈھکی ہوئی گول جھاڑیاں۔ مختلف رنگوں کی گھاس اور اس میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے پتھر جیسے سجائے گئے ہوں اور یہاں بھی ہمارے قدم بٹکتے گئے کیونکہ ہم پھولوں کو روندنا نہیں چاہتے تھے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور ہم پھولوں کے مجرم محسوس کرتے ہوئے چلتے رہے۔ میں تھک جاتا تو کسی پتھر پر بیٹھ کر آس پاس دیکھنے لگا کیونکہ یہاں ہر لمحہ آس پاس بدل جاتا تھا۔

ہماری جمیل نیچے رہ گئی اور اس کے کنارے ہمارے خیمے دو چھوٹی چھوٹی نیلی ٹکٹوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے۔

آج صورت حال بہت بہتر تھی۔ میرا بدن آہستہ آہستہ دیوسائی کی بلندی کا عادی ہو رہا تھا۔ بے چینی بہت کم ہو چکی تھی اور سانس لینا اگرچہ اب بھی دشوار تھا لیکن مشکل نہ تھا۔ عباسی آگے جا رہا تھا۔

ایک نہایت ہی دل کش رنگوں کے پھولوں کا فرش میرے قدموں تلے آیا، میں وہیں ڈھلوان زمین پر لیٹ گیا اور کیمرو آنکھ سے لگا کر ان پھولوں کو فکس میں لینے کی کوشش کرنے لگا اور اسی لئے عباسی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مجھے زمین پر دیکھا تو بھانسا ہوا دایس آیا ”کیا ہوا سرجی خیریت تو ہے“ اس نے مجھے اٹھانے کے لئے ہاتھ آگے کیا اور پھر فوراً ہی اسے احساس ہوا کہ میں تصویر اتار رہا ہوں ”کمال ہے تارڑ صاحب۔ بتا کر لیٹا تھا مجھے خواہ مخواہ زورس کر دیا“

اب میں جہاں کہیں ذرا مختلف پھول دیکھتا وہیں زمین پر لیٹ کر ان کی تصویر بنانے کی کوشش کرتا۔

پورے دیوسائی پر دھوپ اگرچہ مکمل تھی لیکن ہم گرم کپڑوں میں ملبوس تھے اور اپنی اپنی ٹوپوں کو کانٹوں تک کھینچے ہوئے تھے۔

اور جب ہم بلند ترین سطح پر پہنچے تو دیوسائی کا منظر مزید وسیع ہوا اور یہ منظر

مختلف حیرتوں کا مجموعہ تھا، ایک حیرت تو یہ تھی کہ ہم تقریباً بلند ترین مقام پر تھے اور دور جو پہاڑیاں تھیں بلکہ پہاڑیوں کا ایک سلسل تھا جس پر برف کی لکیں تھیں اور ان پر عجیب شکلوں کے بادل تھے اور یہ سب بہت دور تھے لیکن اس سے ادھر تو وہی گھاس بلکہ پھولوں اور جھاڑیوں سے ڈھکے سبز میدان تھے جن پر کہیں دھوپ تھی اور کہیں سایہ تھا اور ان میں دو ندیاں تھیں دور تک دکھائی دیتی اور ان کے کچھ حصے دھوپ میں اور کچھ سائے میں تھے جیسے دھوپ سائے کا ایک ست اڑوہا ہے جو آرام سے ہے۔ اس بلندی سے پرے وہ منظر تھا جو جمیل سے دکھائی نہ دیتا تھا، پوشیدہ تھا اور یہ منظر بہت ہی دیران تھا۔ ایک اور جہان تھا خاموشی کا اور خاموش پتھروں اور میدانوں کا اور وہاں سے بھی ایک ندی اترتی تھی۔ اور سب سے بڑی حیرت تھائی کی تھی، اس عظیم وسعت میں کوئی نہ تھا۔ سوائے اس کے جو ہر جگہ ہے۔ اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ پرندے بھی نہ تھے۔ شاید اتنی بلندی پر کوئی پرندہ اڑان نہیں کر سکتا اس لئے۔

نیچے جمیل پانی کا ایک قطرہ تھی گھاس کے سمندر میں۔ اور ہمارے نیچے دکھائی نہیں دیتے تھے۔

”مارڈ صاحب آپ زیادہ سے زیادہ کتنی بلندی پر گئے ہو؟“

”تقریباً انیس ہزار فٹ تک گیا ہوں۔“

”ہائیں۔“ عباسی کا منہ حیرت سے کھلا ”سچی آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ

ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی بلند کسی چوٹی پر چلے گئے ہیں؟“

”میں ہر پھٹے جب لاہور سے اسلام آباد پرواز کرتا ہوں تو جیٹ ہوائی جہاز تقریباً اسی بلندی پر پرواز کرتا ہے۔“

”ایک تو آپ کی محول کی عادت نہیں جاتی۔ چاہے آپ دیو سائی میں ہی کیوں

نہ ہوں۔ جناب بلند ترین مقام پر ذاتی طور پر کہاں تک گئے ہیں؟“

”شاید میں اب اپنے بلند ترین مقام پر ہوں۔ شاید ٹیلیم وادی کی رتی گلی چوٹی

اس سے ذرا کم ہو یا زیادہ ہو۔“

پھر عباسی کچھ کہہ رہا تھا لیکن میں سن نہیں رہا تھا، میں اس کی طرف دیکھتا تھا

اس کے لب مسلسل مل رہے تھے اور میں کبھی کبھی سر بھی ہلاتا تھا لیکن میں کچھ سن

نہیں رہا تھا کیونکہ وہاں اس آسانی تخت پر اس بلندی پر میں دھوپ میں اور سرد ہوا

”سچی واپس نہ چلیں؟“ میں نے بہت دیر بعد عباسی کی آواز سنی۔

ہم بڑے آرام سے نیچے اترنے لگے۔ دھوپ میں اور پھولوں پر قدم رکھتے۔

ہم آسمان سے اترنے لگے۔

ہم اپنی کیمپ سائٹ سے قریب ہوئے تو وہاں دونوں ٹیموں کے آس پاس دور دور تک موسیٰ دکھائی دے رہے تھے۔ جمیل کنارے ٹیموں تک پہنچے تو سمیر ایک لمبی ٹوپی سر پر رکھے دھوپ میں لیٹا تھا اور سلجوق اس کے سینے پر سر رکھے اپنے ریڈیو کے جھن سمھا رہا تھا۔

”کیا حال ہے؟“ میں نے سمیر کا ماتھا چھوا۔ اسے بخار تھا ”یہ کیا بات ہے سمیر؟“

”بس ابو۔“ اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔ لیکن اس کی شکل اب بیماروں کی

نہ تھی ”تھوڑا سا بخار اور کچھ سر درد“

”یہ موسیٰ کہاں سے آگئے؟“

”یہ صد پارہ والوں کی بمک کے ہیں۔“ سمیر نے بتایا ”آپ تو اوپر چلے گئے اور میں سویا ہوا تھا تو ایک پاک آگیا۔“

”سچ کا پاک؟“

”ہاں ابو وہ دیکھئے“

اور وہاں زندہ تھے اور ان میں ایک شاندار سفید پاک تھا اور بڑی شان سے کھڑا تھا۔

"تو پاک نے آکر میرے خیمے کے پاس ایک زور کی "چھوہ" کی اپنے منتوں کے ساتھ اور پھر ایک لمبی "باہ" کی۔ تو ابو میں سمجھا کہ رچھہ آگیا ہے۔ تب میں نے بھائی جان کو آوازیں دیں کہ بھائی جان رچھہ... اور اوھر سے بھائی جان اپنے خیمے سے جواب دیتے ہیں کہ چپ کر کے لیٹے رہو میرے خیمے کو بھی ایک رچھہ سوگھ رہا ہے۔" میرے منہ میں کر دہرا ہوا تھا "پھر میں نے پورٹری علی کو پکارا تو وہ آگیا اور کہنے لگا صاحب باہر آکر دیکھو باہر کھلا تو یہی سفید والا پاک میرے خیمے سے تھوکتی لگے کھڑا تھا۔"

"سر جی پاک کی تصویر اتارنی چاہئے۔ ہو سکتا ہے اس پاک کی آج تک کسی نے تصویر نہ اتاری ہو" عباسی نے صلاح دی۔

ہم دونوں سفید پاک کے قریب چلے گئے۔ میں نے کیمرو آنکھ سے لگایا اور فوس کرنے لگا تو عباسی کہنے لگا "سر جی ذرا قریب ہو کر پاک کا پورٹریٹ بنالیں۔"

"نہیں۔" میں نے سر ہلایا "میں یہ رسک نہیں لوں گا۔ یہ پاک میری طرف ایسے دیکھتا ہے جیسے وہ مجھے پسند نہیں کرتا۔"

علی اور حسین حسب معمول گور کی آگ جلائے بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ ایک اجنبی براہمن تھا۔۔۔۔۔۔ یہ ان تمام مویشیوں کا رکھوالا تھا جو ہماری خیمہ گاہ کے گرد پھیلے ہوئے تھے۔

"صاحب یہ اوھر صد پارہ کی ہیک سے آیا ہے اور کہتا ہے کہ رات کو ایک یا دو رچھہ آئے اور ایک بھیڑ اٹھا کر لے گئے۔" علی نے بتایا۔

"یہاں کے رچھہ گوشت خور ہیں؟"

"نہیں صاحب۔" وہ شخص کہنے لگا "یہ لے جاتا ہے اٹھا کر اور مار دیتا ہے۔۔۔۔۔۔ اوھر تین روز پہلے اس نے ہمارا ایک گھوڑا مار دیا تھا ابھی تک اوھر میدان میں رکھا ہے۔"

اور ہم نے اس گھوڑے کا ڈھانچہ دیکھا تھا اور اس کے سڑتے ماس کی بو سونگھی تھی۔۔۔۔۔۔

"سر جی یہ بہت اچھی بات ہے کہ ہم دوپہر تک دیو سائی چھوڑ دیں گے۔" عباسی نے سر ہلایا اور ذرا شرارت سے کہا "یہ علاقہ کچھ خطرناک ہوتا جا رہا ہے"

جہاں حد نظر تھی جہاں چھوٹے اور نیلے پہاڑوں کا سلسلہ تھا وہاں جو بادل تھے وہ بتدریج آسمان کو ڈھانچتے جھیل کی طرف آ رہے تھے اور تب دوپہر کے بعد ہم نے اپنے خیمے سینے اور ابھی ہم دیو سائی میدان کے پھولوں پر چلتے تھے کہ چند بوندیں گریں جو پانی نہیں تھیں برف تھیں اور ان کی برقی سردی ہماری جھکی ہوئی گردنوں پر کیلی ہوتی گئی۔

بادل جیسے کسی جادو کے زور سے اٹھتے چلے آ رہے تھے۔ حسین اور علی ہمارے آگے تھے اور ہم تینوں ان کے پیچھے اور ہم ایک جدا راستے سے واپس ہو رہے تھے اور یہ راستہ بھی اس دنیا سے جدا تھا کیونکہ اس پر پتے اور گل بوٹے تھے وہ اس دنیا کے نہیں تھے لیکن ہم کیا کرتے ہم تو اس دنیا کے تھے اور ہم اس دنیا کو چھوڑ رہے تھے جس میں یہ پتے گل بوٹے تھے۔ جس میں ہم نے اگرچہ صرف ایک شب گزاری لیکن دراصل ایک عمر گزاری۔۔۔۔۔۔ اور جب ہم نے کل دیو سائی پر قدم رکھا تھا تو بدن میں بے چینی اور دیرانی تھی بدنی کی وجہ سے اور اب بھی بے چینی تھی اور دیرانی تھی بدن میں۔ لیکن جدائی کی وجہ سے۔۔۔۔۔۔ ہم ایک دنیا سے جدا ہوتے تھے اک جہان سے رخصت ہوتے تھے۔ ہمارے قدم بے ربط ہوتے تھے اور ہم پھولوں کو روندنا نہیں چاہتے تھے۔

میرا اب آگے چل رہا تھا۔۔۔۔۔۔ صرف جوانی کی مستی اسے آگے لے جاتی تھی ورنہ اس کا ماتھا بخار سے چلتا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ جھکتا تھا اور دیو سائی کے پھول چنتا تھا۔۔۔۔۔۔

"یہ پھول نیچے سکر دو میں زندہ نہیں رہے صاحب۔" علی بھی جھکا اور اس نے ایک چھوٹی پلیٹ جتنا پھول نما ہوا توڑا اور میر کو دے دیا۔

بارش کی چند بوندیں اور گریں۔

میرے راستے میں پھولوں کی زرد کنوریاں تھیں، میں نے جبک کر انہیں سمیٹا اور میر کے حوالے کر دیں۔

اب یہ ایک کھیل تھا، ہم جبک جبک کر ایسے پھول تلاش کرتے تھے جو میر کے پاس نہ تھے۔ ہاں یہ میرے پاس نہیں ہے۔ نہیں نہیں یہ تو ہے۔ سرخ نخل پھول اس کے پتے رخساروں کی طرح تھے۔

ہمارے اوپر بادلوں کا کھیل ہو رہا تھا، وہ اٹھتے چلے آتے تھے، گہرے اور پانیوں سے بوجھل ہوتے جیسے ہمارا پیچھا کر رہے ہوں۔ ہم خوش قسمت تھے کہ ہمیں دیو سائی پر صاف موسم ملے۔

”بارش آئے گی صاحب۔“ علی بار بار اور دیکھتا تھا۔

جب پھول اور پتے اور بوٹے جو میر جم کرنا تھا زیادہ ہو جاتے تو وہ انہیں سلجوق کے رک سیک کی پچھلی جیب میں ڈال دیتا۔

میرے آگے آگے سلجوق چلتا تھا اور دیوسائی کے رنگ اور پودے اس کے رک سیک کی پچھلی جیب میں سے نکلتے تھے جیسے پرندے ہوں جو وہیں رہ جانا چاہتے ہوں جہاں سے ان کو لے جایا جا رہا تھا۔ اور وہ جانتے تھے کہ وہ وہاں زندہ نہیں رہیں گے جہاں ان کو لے جایا جا رہا تھا۔۔۔

دیوسائی کا کنارہ آگیا۔ اس جلدی سمندر کا کنارہ جس میں ہم غیموں کی بادبانی کشتیوں کے ساتھ اترے تھے۔

ہمارے سروں پر بادل جھک رہے تھے اور عجیب بات ہے کہ بالکل چپ تھے ان میں گرج یا جھک نہ تھی۔۔۔ وہ خاموشی سے پیچھے چلے آتے تھے۔

ہم دیوسائی کے کنارے پر کھڑے ہو گئے۔ جیب روڈ نیچے صد پارہ کو اتر رہی تھی جیسے ایک زینہ اتر رہا ہو۔۔۔ ہم نے اس زینے پر قدم رکھا اور دیوسائی سے الگ ہو گئے۔

ہم کے ٹو ہوٹل سکروڈ کے اس کمرے میں داخل ہوئے جس میں مینی اور میمونہ ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔

انہوں نے بولنا شروع کر دیا۔۔۔ لیکن ہمارے کانوں میں ایک ایسا سناٹا تھا جس میں ہم ابھی تک گم تھے اور ہم سن نہیں سکتے تھے۔۔۔ میر کا بخار اتر چکا تھا اور وہ مسکرا رہا تھا۔۔۔ دور کہیں میمونہ کی آواز آئی ”۔۔۔۔۔ تم سب بولتے کیوں نہیں“ اور ہمارے کانوں میں سناٹے کی گونج تھی جو ہم ساتھ لے کر آ گئے تھے۔

سلجوق نے رک سیک کی جیب میں سے دیوسائی کے مرتے ہوئے پھولوں کو نکالا اور ایک گلدان میں ڈال دیا۔۔۔ وہ مڑھانچکے تھے۔

”ہائے۔“ میمونہ کی ہتھیلی اس کے سینے پر مٹی ”یہ رنگ کیسے ہیں؟“ اس کے چہرے پر ایک ناقابل یقین حیرت تھی۔

ہم تینوں مسکراتے رہے۔ ہم وہیں تھے جہاں سے یہ رنگ آئے تھے۔